NATIONAL PRESS URDU LITERATURE SERIES No. 21.

تذکرہ
نیرنگ سودا

مؤلفہ
منشی عبد الرفیع صاحب علوی اثر کاکوروی

پبلشر
لالہ رام نرائن لعل بکسیلر
الہ آباد
۱۹۳۵ء

قیمت

بار اول

تعارف

جدید تعلیم اور جدید تہذیب و تمدّن کا ایک یہ بھی اثر ہے کہ اب لوگ اپنی قدیم تہذیب و تمدّن کے ساتھ ساتھ قدیم علوم و فنون اور قدیم علمائ سے بھی دور ہوتے جاتے ہیں اور جب کبھی اتفاقیہ طور پر ان باتوں کا تذکرہ ہوتا ہے تو مُنہ بنا کر رہ جاتے ہیں، اِس کے معنی یہ ہیں کہ اب وہ اُن چیزوں کو پسند ہی نہیں کرتے۔ اور لطف یہ ہے کہ انھیں باتوں کے لئے روتے ہیں۔ ممکن ہے کہ زمانے کے تغیّرات و انقلابات کے ساتھ ساتھ قدیم علوم و فنون کے معیار میں بھی تبدیلی ہو گئی ہو۔ لیکن ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا انھیں سر چشموں سے آج بھی اپنی پیاس بُجھا رہی ہے۔ اِن علوم سے نفرت اور قدیم علمائ کے نظریات سے بُعد ہونے کے باوجود دشنام بازی کے موقع پر انھیں باتوں سے کام لیا جاتا ہے۔

اِن مشرقی علوم و فنون میں اس وقت ہمارے سامنے بہت سے علوم و فنون ہیں جن کو آج جی کھول کر بدنام کرنے کی

کوشش کی جارہی ہے، بدنصیبی سے نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے
اور بے خبری کا یہ عالم ہے، کہ ہم اپنے علمائے ادب کو بھی فراموش
کر بیٹھے۔ اور اب اگر کوئی مثال بھی اس قسم کی پیش کرتے ہیں تو ہم
مشرق کی بجائے مغرب میں دوڑتے پھرتے ہیں، حالانکہ تہذیب و
تمدّن کے اعتبار سے مشرق و مغرب میں زمین آسمان کا فرق
ہے۔ قدرۃً ہونا یہ چاہئے کہ جس سرزمین پر بستے اور جس ماحول میں
سانس لیتے ہوں انھیں سے متاثر ہوں اور اُنھیں باتوں کو اپنی زندگی
کے ساتھ مطابقت کے لئے مثال میں پیش کریں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں
ہوتا ہے، فن شعر و سخن ہی کو لیجئے کہ ہمارے نوجوان جب کبھی اِس
مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں تو اُن کے سامنے بیکن۔ ہومر۔ شیلی اور
شکسپیر کی تعلیم کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی، جب کبھی کچھ لکھنے
بیٹھیں گے تو ہمیشہ اس بات کی کوشش کرینگے کہ اپنے خیالات
کو مضبوط بنانے کے لئے بڑے فخر سے مغربی شعراء کے خیالات پیش
کریں، گویا اُن کے نزدیک صنف شاعری کی تکمیل اُس وقت تک
ہو ہی نہیں سکتی جب تک مغربی شعراء کے خیالات سے استفادہ نہ
حاصل کیا جائے۔ اگر یہ صورت یہیں تک ہوتی تو ہم اس کو بھی غنیمت
سمجھتے۔ بڑا ظلم تو یہ ہے کہ ایشیائی شاعری اور ایشیائی شعراء کا مذاق

اُڑاتے ہیں حالانکہ نہ اُنھوں نے کبھی ایشیائی شاعری کا مطالعہ کیا
اور نہ ایشیائی شعراء کے خیالات سے سبق لینے کی کوشش کی لیکن
ایراد و اعتراض کے لئے ہزاروں مواقع اُن کو میسر آتے رہتے ہیں۔
یہ بلا ممکن ہے کہ اور ممالک میں بھی ہو۔ ہمیں نہیں معلوم۔ اور اگر
ہے بھی تو وہ بہت خفیف۔ مگر اس کے مقابلہ میں آج ہندوستان
کے گوشے گوشے میں ایسے ادیب موجود ہیں کہ جب کبھی قلم اُٹھاتے
ہیں تو وہ صرف اس لئے کہ اُردو زبان اور اُردو زبان کی شاعری
میں لے دے کے صرف ایک ہی بات نظر آتی ہے کہ یہاں حسن و
عشق سے زیادہ کھیلا جاتا ہے۔ خیالی داستانوں سے مصنوعی جذبات
کی تزئین کی جاتی ہے۔ حالانکہ آج دنیا کی کوئی زبان اور کوئی شاعری
اس سے محفوظ نہیں ہے۔ بلکہ میں بلا خیال تردید یہاں تک کہنے
کے لئے تیار ہوں کہ مغربی شاعری میں بجائے رفعت خیال کے
انتہائی پستی موجود ہے اور اس کو سراہا جاتا ہے۔ مگر یہ سب کیوں ؟
صرف اس لئے کہ لوگ اُردو زبان اور اُردو شاعری کی نازک خیالیوں
سے ناواقف ہیں۔ اُنھوں نے ابھی تک صحیح معنوں میں کسی کامل
اُردو شاعر کے نازک خیالات کا مطالعہ نہیں کیا ہے اور اگر کیا بھی
تو مخالفانہ نظر سے بیکن۔ ہومر۔ شکسپیر مغرب کے واسطے سرمایۂ ناز

ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے لئے نہیں۔ سرزمین ہند نے بھی ایسے صدہا مایۂ ناز شعراء پیدا کئے ہیں کہ آج اُن کا جواب دوسرے ممالک میں بھی موجود نہیں۔ اُردو زبان کی شاعری میں ممکن ہے کہ الفاظ کا مجموعہ زیادہ نہ ہو۔ لیکن خیالات اور جذبات کی کمی نہیں۔ معقول پسند طبائع جن کے دل و دماغ مغرب کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جنھوں نے مشرقی اور مغربی دونوں تہذیب و تمدن کا مقابلہ کیا ہے، وہ اچھی طرح اس حقیقت سے آگاہ ہیں اور جن لوگوں نے علم و فن کی حیثیت سے اُردو زبان کی شاعری کو نہیں دیکھا اور جن کے دماغ پر ابھی مغرب کا رنگ جما ہوا ہے ہم کو اُن سے اور کیا توقع کرنا چاہیئے۔ اس بارے میں دراصل قصور ہمارا بھی ہے کہ ہم نے خود ادبیات سے اُن کو روشناس نہیں کیا اور نہ اُن کو اس بات کا موقع دیا۔ بدنصیبی سے آج ہمارے نصاب تعلیم میں بھی اس قسم کی کوئی جامع تصنیف شامل نہیں ہے جو نوجوانوں کو مغرب اور مشرق کی ادبیات میں تمیز کرنے کا موقع دے، ورنہ بڑی حد تک اس کمی کو دور کیا جا سکتا تھا۔ جو کتابیں نصاب میں شامل ہیں اُن کو ایسے رنگ میں پیش کیا گیا ہے، جس سے بجائے فائدہ ہونے کے نقصان پہنچتا ہے، ہمارے بھولے بھالے نوجوان آنکھ کھولتے ہی مغربی تہذیب و تمدّن کے آغوش میں

دے دے جاتے ہیں اور وہ اُسی ماحول میں تربیت وتعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اوّل تو اُن کو ادبی حیثیت سے کچھ پڑھایا ہی نہیں جاتا اور جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ مغربی علوم کا پس خوردہ ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ ہومر اور شکسپیر کے سامنے میر و غالب کی کیا قدر کر سکتے ہیں۔ اُردو کی چند نامعلوم کتابیں ایسے زمانے میں اُن کو دی جاتی ہیں کہ جن پر وہ ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ بھی ضمنی حیثیت سے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود اُن کے دل میں بھی اپنی ادبی کتابوں کے مطالعہ کا کوئی جذبہ نہیں پیدا ہوتا، یہ ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے اور اِسی وجہ سے اُردو زبان اور اُس کی شاعری کے متعلق اُن کی معلومات نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔

اُردو زبان کی بنیادی حیثیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوسکتا ہے کہ جن حالات میں اس زبان کی بنیاد رکھی گئی تھی وہ کس قدر مہتم بالشان اہمیت رکھتی تھی۔ زبان اُردو میں جس قدر ہمہ گیری اور جاذبیت ہے شاید اور کسی زبان میں اس قدر نہ ہوگی یہی وجہ تھی کہ اُردو نے اسی تھوڑے سے زمانے میں اسقدر ترقی کی۔ آج اُس کے بولنے والے ممالک غیر میں بھی کافی تعداد میں

موجود ہیں۔ اسی طرح اُردو زبان کی شاعری نے بھی باوجود اپنی کم مائگی اور بے بضاعتی کے ایسے ایسے دل و دماغ پیدا کیے کہ آج اُن کا شہرہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دور دور ملکوں میں بھی ہو رہا ہے اور آج اُردو صرف زبان ہی کی حیثیت نہیں رکھتی ہے بلکہ اب اس کو علم کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ اُردو زبان کے ماہرین، اُردو شعراء اور اُردو ادب پر جو کتابیں اب تک لکھی گئی ہیں وہ اوّل تو بہت ناکافی ہیں اور اس کے علاوہ اُن میں اکثر ایسی بھی ہیں جو محض ایک شخص کی شخصیت کو اُبھارنے کے لئے سامنے لائی گئی ہیں اور بقیہ افراد کے متعلق بے سرو پا اور منگڑھت باتیں لکھ کر اس فرض کو ادا کر دیا ہے جس سے کہ خود اُن کی شخصیت تاریکی میں رہ گئی اور لوگوں کی اس سے غلط رہنمائی ہوئی اُس قسم کی صدہا مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ لیکن یہ موقع اُن کے پیش کرنے کا نہیں، ہمارا مقصود تو صرف یہ بتانا ہے کہ اگر اُردو زبان کی کسی مایۂ ناز ہستی کے متعلق کچھ پیش بھی کیا گیا تو ان میں اتنے اختصار اور اتنے تصنّع سے کام لیا گیا کہ وہ چیز بجائے خود غلط فہمیوں کا مجموعہ بن گئی۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتابیں اس حد تک مفید نہیں ہو سکتیں، ضرورت یہ ہے کہ جس ماہر زبان اور شاعر کامل

کے متعلق کچھ پیش کیا جاتا، اُس کو ہر حیثیت سے پیش کیا جاتا کہ اُس پر ادب اُردو کی ترقی کی بنیاد رکھی جا سکے۔

بہر حال اس سلسلہ میں آج ہم ایک جدید تالیف "نیرنگ سودا" کو پیش کر رہے ہیں جس کو غالباً انھیں حالات سے متاثر ہونے کے بعد لکھا گیا ہے، یہ نئی تالیف ہمارے اُردو کے نہایت ناحی اور علم پرور قصبہ کاکوری کے ایک نہایت قابل، نہایت ذی علم، نہایت محقق اور نقاد فن جناب منشی عبدالرفیع صاحب اثرؔ کے زور قلم کی سعی بلیغ اور کاوش و تحقیق کا نتیجہ ہے، تنقید پر تنقید، تبصرہ پر تبصرہ اور مقدمہ لکھنا کوئی آسان بات نہیں اور نہ اس حالت میں کہ وہ تبصرہ یا تنقید مجموعی حیثیت سے خود اس قدر مکمل ہو کہ اُس پر قلم اُٹھانے کی بھی گنجائش نہ ہو۔ "نیرنگ سودا" جس کا میں اس موقع پر تذکرہ کر رہا ہوں وہ دراصل ایک ایسی ہی تالیف ہے کہ جس پر کچھ اور لکھنا میرے لئے ایک مشکل سوال ہے۔ لیکن نہ لکھنا بھی اب میرے مقدور سے باہر ہے۔ اس لئے کہ مؤلف نے جس دردسری، کاوش اور دل سوزی کے بعد ادبیات اُردو کے ایک جامع کمالات شخصیت کے متعلق اپنے گہرے مطالعہ کا نتیجہ پیش کیا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ اُس کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ لکھنے کی

ضرورت ہے، "نیرنگ سودا" اُردو کے ایک قادر الکلام، اُستادِ فن شاعر مرزا رفیع السودا کا ایک نادر و بے بہا تذکرہ ہے۔ مرزا رفیع سودا کے متعلق عام خیال تو یہ ہے کہ وہ ایک بے باک شاعر تھے اور ہجو گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اہلِ فن، سخن شناس اور نقّاد باکمال سے ہرگز یہ پوشیدہ نہیں کہ مرزا رفیع السودا، میرؔ کے ہمعصر شعراء میں وہ درجہ رکھتے تھے جو دوسرے کو نصیب نہیں ۔

سودا نے اُردو کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں کیا کیا کارہائے نمایاں کئے ہیں اور اُردو شاعری کی ہر صنف میں وہ وہ کمال دکھائے ہیں جن پر اُردو جس قدر ناز کرے وہ کم ہے۔ لیکن یہ بھی اتفاقات زمانہ سے ہے کہ اب تک جس بزم میں سودا کا تذکرہ ہوتا ہے وہ محض ایک ہجو گو شاعر کی حیثیت سے آتا ہے۔ حالانکہ مرزا کی طبّاعی ذہانت اور رعلہ ہنیالی نے کوئی میدان ایسا نہیں چھوڑا جہاں مرزا کا اسپ تیز گام طرارے بھرتا ہوا نہ نظر آتا ہو اور جس طرف مرزا اس کی باگ موڑ دیتے ہیں اُس میں ایک دوسرا راستہ بھی پیدا ہو جاتا ہے، مرزا کے قصائد ہی کو لیجئے وہ اس مرتبے کے ہیں کہ آج بھی اُن کا کوئی جواب نہیں پیدا ہو سکا، اگرچہ مرزا کے معاصرین میں بڑے بڑے اساتذۂ فن تھے اور میر سا

اُستاد کامل موجود تھا، لیکن وہ بھی باوجود شاعرانہ نوک جھونک کے مرزا کا معترف رہا یا یوں کہیئے کہ مرزا کے کمال نے اُن کو معترف بنا کر چھوڑا۔

پیش نظر تالیف میں سوداؔ کی شاعری پر نہایت گہرا تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بات اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہے کہ جب لکھنے والے نے بھی گہرا مطالعہ کیا ہو۔ سوداؔ کی شاعری پر کچھ لکھنے سے پہلے اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ مرزا کے معاصرین کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ نیرنگ سوداؔ کے دیکھنے سے یہ بات پورے طور سے واضح ہو جاتی ہے کہ نہ صرف سوداؔ کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے بلکہ مرزا کے معاصرین کو بھی اس مطالعہ میں شریک کیا گیا ہے ہمارے نزدیک مؤلف نے یہ ایک بڑا کام انجام دیا ہے اور اب اسوقت سوداؔ کی عظمت اور اُن کے کلام کی رفعت کا ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا کس پائے کے شاعر تھے اور مرزا کا مرتبہ کس قدر بلند تھا۔
ہمیں اس قسم کے سیکڑوں تذکروں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، لیکن اِن میں سے ہر ایک کا طرز یکساں معلوم ہوتا ہے اور بالعموم یہی کیا گیا ہے کہ مختصر سوانح حیات کے بعد کچھ کلام کا انتخاب پیش کر کے اس فرض کو پورا کر دیا، لیکن "نیرنگ سوداؔ" میں وہ طرز تحریر

اختیار نہیں کیا گیا بلکہ سب سے الگ ایک شاہراہ قائم کی گئی ہے
جو فہرست مضامین یا کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتی ہے
کہ جس سے ایک مبتدی بھی فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور ایک منتہی بھی
اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے کسی شاعر کے کلام کی خوبیاں
اُس وقت معلوم ہو سکتی ہیں جب اُس کے متعلق متعدد رائیں
بھی موجود ہوں۔ چنانچہ "نیرنگ سودا" میں اس اہتمام کو بھی
ملحوظ رکھا گیا ہے اور بڑی جانکاہی سے مختلف اُردو کے تذکرہ نویسوں
کے آرا کو بھی یکجا کر دیا ہے تاکہ سمجھنے والے پوری طرح یہ سمجھ لیں
کہ جس کلام کو اس وقت پیش کیا جا رہا ہے وہ دراصل ایک
ایسی ہستی ہے کہ جس کے کلام کو اُردو ادبیات کی رہنمائی کا ذریعہ
بنایا جائے۔ اس مختصر تحریر میں اس کی گنجائش نہیں، ورنہ ہم ہر
چیز کو علیحدہ علیحدہ دکھاتے اور ہر ایک پر کافی روشنی ڈالتے۔
ممکن ہے کہ ہم کو مؤلف نیرنگ سودا یا خود اُن تذکرہ نویسوں
سے جن کا یا جن کی تحریر کا اس میں حوالہ دیا گیا ہے کہیں کہیں خیالی
اختلاف ہو لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ مؤلف کی سعی، مؤلف کی کاوش
ہر طرح قابل ستائش اور لائق تحسین ہے۔

ہمارے نزدیک ایسی ہی کتابیں ادبیات کے لئے مفید

ثابت ہو سکتی ہیں اور اگر اس قسم کی تالیفات کو نصاب تعلیم میں داخل کیا جائے تو یقیناً آنے والی نسلیں اپنی ادبیات سے بے خبر نہ رہیں گی۔ ہم نہایت پُر زور الفاظ میں جناب آثر کی اس بلند پایہ تحقیق کی داد دیتے ہیں۔

درحقیقت جناب آثر نے نیرنگ سودا لکھکر اُردو ادب بلکہ دنیائے اُردو پر ایک عظیم الشّان احسان کیا ہے، ہماری دعا ہے کہ خدا اس کو مقبول عام بنائے، ملک و قوم اس کی قدر کرے اور سر رشتۂ تعلیم کا ہر عنصر اس سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

وصل بلگرامی
قیصر باغ لکھنؤ

۱۱ ستمبر ۳۵ء

حامداً و مصلّیاً

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

سودا نگاہِ دیدۂ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر ایک ذرّے میں ہے آفتاب کا

جس طرح سانس کی آمد و شد بلا دل کی اہم کمزوری بند نہیں ہو سکتی، نبض کی رفتار بغیر کسی خاص مرض کے غیر منتظم نہیں ہوتی۔ قلب کی حرکت بلا کسی خاص وجہ کے رُک نہیں جاتی۔ شعراء کا عالمِ خیال افکارِ مضامین سے کبھی خالی نہیں رہتا۔ آسمان گردش سے، سمندر لہروں سے، ہوا چلنے سے باز نہیں رہتی۔ اسی طرح دنیا کبھی علوم و فنون سے خالی نہیں رہی۔

اِن حالات پر نظر ڈالتے ہوئے یہ امر کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ آج ہندوستان کا ہر جادو نگار ادیب رنگین بیان، سخن طراز، بدیع السیر، بذلہ سنج اپنی طبعِ رنگین کی بوقلمونی اور اپنے قلم کا جوہر

دکھانے کے لئے جب عنانِ شبدیز اُٹھاتا ہے تو اُردو زبان کی تمام بے بنیاد بُرائیاں اور فرضی غلطیاں ظاہر کرنے میں کوئی جزاختیاری پہلو کا بچا نہیں رکھتا اور تمام بھلی چیزوں کو بدتر رنگ میں دکھلانے کا مضبوط و مستقل تہیّہ کر لیتا ہے اور ملک کی موجودہ بیدار یا خفتہ شاعری پر کچھ ایسا مصنوعی رنگ و روغن چڑھاتا ہے جو اپنی شوخی اور تڑپ کی وجہ سے فوراً کھپ جاتا اور بھلا نظر آتا ہے، مگر اپنی خامی و ناپائداری کی وجہ سے تھوڑی سی دیر میں اُڑ جاتا ہے طرّہ یہ ہے کہ اُسی جوش و خروش، غم اور غصّہ میں وہ عشقیہ شاعری پر فقط نوک جھوک ہی پر بس نہیں کرتا بلکہ مخرب اخلاق سمجھ کر اُس کی تضحیک و تذلیل کے لئے اپنے بخارات کا آبشار گرا کر کلیجے کو ٹھنڈا کر لیتا ہے۔

آج دنیا پر کسی حیثیت سے کیوں نہ نظر ڈالی جائے آفرینش کی ابتدا سے لیکر اب تک ہر ملک اور قوم کے لئے حُسن و عشق کے ارفع ترین جذبات الہام شعری کے باعث ہوئے حُسن وہ آتشیں جذبہ یا خوشنما اور نازک کانٹا ہے جو سب سے پہلے آنکھ میں چُبھتا ہے یا نشتر بن کر دل کو زخمی کرتا ہے۔ یا ایک پھول ہے جو اپنی خوشبو سے دل کو مست کرتا ہے یا وہ موتی ہے جو اپنی چمک سے خود ہی

تڑپنے لگتا ہے۔

عشق کی ابتدا ازل سے ہوئی۔ اُس کی تعمیر خون سے اُس کی رنگ آمیزی جگر کے ٹکڑوں سے یاس وحسرت اُس کی علمبردار، چہرے کی زردی اُس کی پہچان اور اسی قوس قزح کی مصوّری ہمارے قدیم شعراء کا طرّہ امتیاز تھا۔

یہ خیالی داستان گو پرانی سہی مگر سرتاسر حقیقت میں ڈوبی ہوئی ہے اس لئے کہ دنیا کی کوئی زبان عشق و محبت کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوسکی اور ہر ملک اور ہر زبان میں ہزاروں قصّے سیکڑوں داستانیں لاکھوں افسانے موجود پائے جاتے ہیں۔ جن کی جان محبت ہے۔ خواہ وہ حقیقی ہوں یا مجازی۔

آج عشقیہ شاعری سے نفرت رکھنے والے اور نا عاقبت اندیشانہ رویّے پر چلنے والوں کی یہ دلیل ذرا بھی معقولیت کا جامہ نہیں پہن سکتی کہ اُن کے کلیجے اور دل عشق کے جذبات سے بالکل ہی متاثر نہیں ہوتے اور وہ تیر نظر کے سحر آفریں نشانے سے شمشیر ابرو کی جنبش سے۔ لبِ جاں بخش کے اعجاز سے برائے نام بھی بے چین اور مضطرب نہیں ہوتے ؎

شوخیِ حُسن حسینوں کے ہر انداز میں ہے　　کبھی چتون میں کبھی پردۂ آواز میں ہے

یہاں تک کہ تمام باطنی حسیات کی قوتوں اور قلبی جذبات پر ظلمت کی گھٹا چھا جاتی اور غفلت کی شراب اُنھیں بیخود اور مست بنا دیتی ہے مگر واقعات کا ورق جب اُلٹا جاتا ہے تو یہ کھلتا ہے کہ حقیقتاً وہ فرضی عاشق بن کر رندی اور اوباشی کو سچّا عشق سمجھ رہے ہیں اور دواوین پڑھ پڑھکر بازاری عشق سے تعلّق رکھنے والے جذبات کو اپنے الفاظ میں ڈھال کر اصلی شاعری کا غلط چربہ اُتارنے میں بے وجہ اور بے کار اپنے دل و دماغ کو متوجہ اور مصروف کر دیتے ہیں مگر جس طرح سچ اور جھوٹ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جس طرح در و دیوار پر بنے ہوئے نقش و نگار اصل اور نقل کا فرق دکھلانے میں دھوکا نہیں دیتے اور دودھ کا دودھ۔ پانی کا پانی الگ کرنے میں حُسن و قبُح کو نمایاں کر دیتے ہیں اُسی طرح حُسن شعری اوباشانہ اور رندانہ بداخلاقیوں کی تعفّن خیز کثافتوں کی متحمّل نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ رُعب جمال انسان کی تنقیدی قوت کو سلب کر لیتا ہے اور حُسن کی گراں مایگی ہر عیب کی پردہ پوشی کرتی ہے لیکن پتّھر کے ٹکڑوں میں بلور کی چمک نہیں آسکتی۔ اگر اُردو شاعری اپنی کم مایگی اور بے بضاعتی کی وجہ سے علمی مطالب ادا کرنے سے قاصر ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم شاعری کے

تمام وکمال قواعد وضوابط۔ اصول وفروع کو بالائے طاق رکھدیں ۔
زیادہ سے زیادہ اگر ہم کچھ کر سکتے ہیں تو صرف یہ کہ جذبات رکیکہ سے،
غم عشق کی جانکاہ اور دلسوز داستانوں سے' شب ہجر کی مصیبتوں سے'
تمنّائے وصال کی مصنوعی بیتابیوں سے گریز کریں۔ اور ایسے افسانوں
سے جن میں حُسن وعشق کی مضراب ہَوا اور ہوس کے تاروں کو جنبش
دیتی' سوزش کو بڑھاتی ہے یا جوانی کے ترنّم ریز بلبل فطرت کے
اقتضا سے حزن اور جوش کے نغمے الاپتی ہے ۔ پرہیز کریں ۔
مگر شاعرانہ جذبات جس وقت اصلیت کا جامہ پہنے ہوئے
اُبھرتے ہیں' اُس وقت اُن کی دیکھ بھال۔ روک تھام قوت انسانی
سے باہر ہو جاتی ہے اور کوئی بھی کامیابی کے در تک نہیں پہنچ سکتی۔
لیکن جوانی کے بعد جذبات سابقہ میں ٹھنڈک اور انتہائی
برودت پیدا ہو جاتی ہے اور پچھلی ہلچل اور سوزش بالکل باقی
نہیں رہتی۔ گزشتہ سماں ایک حیرت انگیز خیال و خواب ہو جاتا ہے۔
اُس وقت جو جذبات پیدا ہوتے ہیں اور جس قدر تخیلات دماغ
میں گونجتے ہیں اُن میں بے نمکی اور بدمزگی پیدا ہوتی ہے اور وہ
تمام وکمال زبان کا اعجاز۔ الفاظ کا جادو۔ استعارات کا منتر تشبیہات
کی طلسم بندی فضول اور بیکار ہو جاتی ہے اور اس طرح اُس قلبی

مسرّت میں اچھی خاصی انقبازی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور کلام کی تمامتر روانی۔ زبان کی گوناگوں شوخی۔ طبیعت کی جولانی گاؤخورد نظر آتی ہے ؎

خود کو سنبھالتا کہ میں دل کو سنبھالتا
اک بیخودی تھی ہوش تھا یارب کہاں مجھے

اس صورتِ حال پر نظر کر کے یہ خیال قائم کرنا کہ پارینہ خیالات دقیانوسی قصّوں سے گریز کرنا اچھی اور بہتر صورت ہے سراسر غلط ہے۔ کارگاہِ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ بیمار کی عیادت انسانی فرض ہے اور اُس کی تیمار داری اور بھی اہم اور ضروری چیز ہے جس طریقے سے جس عنوان سے اور جس نہج سے ممکن ہو سکے۔ زبان کی امداد۔ اعانت۔ دستگیری۔ دامے۔ درمے۔ قدمے۔ سُخنے ضروری ہے۔ زبان سے تو آپ کو کوئی دشمنی۔ عداوت خصومت نہیں کہ ہر آسان اور سہل خدمت سے ارادۃً گریز کیا جائے۔

ہندوستان میں اُردو شاعری کا بنیادی پتھر حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے رکھا تھا۔ جن کی جدّت۔ طباعی۔ ذکاوت کے اختراع کا یہ نتیجہ ہوا کہ آج غزل غزل ہو کر کس قدر اونچی اور بلند ہو گئی اور کچھ عجب نہیں کہ اُنھیں پاک نفس بزرگ کا یہ بھی کوئی تصرف

ہوکہ ایک صدی کے بعد بھی اُن کے صاف سینے اور قلب سے نکلے ہوئے جذبات آج تک ٹھنڈے اور سرد نہ پڑ سکے۔

اگرچہ وہ شعلے اور انگارے اُتنے بھڑکتے ہوئے اور روشن نہ تھے اور بہت کچھ بجھ بھی چکے تھے مگر اندر کی دبی ہوئی چنگاریاں آہستہ آہستہ بڑھتی رہیں اور دربار عالمگیر میں گزرتی ہوئی محمد شاہ اور شاہ عالم کے دربار تک پہنچ گئیں۔

شعرا سے اُس وقت کا ہر ہر گلی کوچہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور ہر شاعر اپنے رنگ میں بدمست اور سرشار تھا۔

مشاعروں کی صحبتوں سے اور اُن کے لگاتار اور مسلسل جھگڑوں سے فرصت ملنا دشوار تھی اور اس طرح دن اور رات کا کوئی حصّہ کم خالی ملتا تھا۔ غرضکہ ایسی صحبتوں کا دوبارہ دیکھنا فلک کو بھی نصیب نہ ہو سکا۔ شعرا کے گروہ میں کوئی عرفیِ وقت تھا تو کوئی صائبِ عہد۔

اس کے بعد شعرا کے کئی دَور ہوئے اور مٹے۔ دَورِ اوّل میں شاہ مبارک آرزو۔ میر مکن پاکباز۔ شیخ شرف الدین مضمون۔ محمد شاہ کرناجی۔ محمد احسن احسن۔ مصطفےٰ خاں یکرنگ۔ دوسرے میں شاہ حاتم حاتم۔ شاہ تسنیم تسنیم۔ محمد امان نثار۔ خانِ ہدایت ہدایت

خان آرزو آرزو۔ اشرف علی خاں فغاں۔ تیسرے میں میرزا مظہر جانجاناں۔ تاباں۔ سودا۔ میر تقی میر وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ زبانِ اردو جن شعراء پر فخر اور ناز کر رہی ہے اور جنھوں نے اُس کی اصلاح اور درستی کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ جن لوگوں کے سر اس کا سہرا رہا اُنھیں میں سے ایک فرد مرزا رفیع السودا تھے جن کی شاعری پر آئندہ اوراق میں کچھ عرض کرنا ہے۔

مختصر سوانح سودا

مرزا محمد رفیع نام اور سودا تخلص تھا۔ اُن کے باپ مرزا محمد شفیع کابل کے رہنے والے تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے۔ آبائی پیشہ سپہ گری تھا۔ ہندوستان کی آب و ہوا نے یہاں سے جانے نہ دیا۔ تعلیم و تربیت تمام و کمال دلّی میں ہوئی۔ کابلی دروازے میں گھر تھا۔ اُن کی شاگردی کی بابت مختلف روایات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ خانِ آرزو کے شاگرد تھے لیکن یہ غلط ہے۔ اُن کے یہاں صرف نشست زیادہ رہتی تھی۔ صحیح یہ ہے کہ سودا پہلے سلیمان قلی کے شاگرد ہوئے اُس کے بعد شاہ حاتم کے۔ دیوان کے دیباچے میں شاہ صاحب نے میرزا کا نام جس عنوان سے شاگردوں کی فہرست میں لکھا ہے اُس سے فخر کی جھلک آتی ہے۔ پہلے فارسی میں شعر

کہا کرتے تھے مگر خانِ آرزو کی اس نصیحت پر کہ میرزا فارسی اب تمھاری مادری زبان نہیں رہی تمھارا کلام اہلِ زبان کے مقابلے میں قابلِ تعریف نہ ہوگا۔ طبیعت میں موزونیت ہے۔ شاعری سے مناسبت رکھتے ہو، اُردو میں شعر کہا کرو تو یکتائے زمانہ ہوگے۔ میرزا سنبھل گئے اور نصیحت پر عمل کیا۔

سوداؔ فقط طبعی شاعر نہ تھے بلکہ اس فن کے تمام اصول وفروع کے ماہر تھے۔ شاعرانہ معلومات اور نقادی کا دائرہ وسیع تھا۔ فارسی عبارت میں شوخی کے ساتھ شگفتگی تھی زبان شیریں تھی۔ تحقیقات کے ابر سے ہجو کی بجلی بھی اکثر چمکتی رہتی تھی۔ اپنے معاصرین اور ہچشموں سے مقابلے کے لئے ہر وقت کیل کانٹے سے تیار اور آمادہ رہتے تھے۔

اُردو شاعری کی ابتدائی داغ بیل جو ولیؔ دکنی نے ڈالی تھی اُس میں سیکڑوں ہی کانٹے اور جھاڑیاں اور صدہا جھکار۔ بیسوں خودرو پودے تھے جن کی صفائی بعد کے شعرا نے کی۔ اِنھیں میں سے ایک شاہ حاتم میرزا کے اُستاد تھے۔ اس ہموار شدہ تختے پر سوداؔ نے جو فلک فرسا عمارت کھڑی کی اور اُس میں جس قدر نقش ونگار بنائے دنیا اُنھیں حیرت سے آج دیکھ رہی ہے۔ قصیدے اور ہجو کا اضافہ کیا۔ کثرت سے فارسی تشبیہیں۔ استعارے۔ بندشیں۔ ترکیبیں۔ محاورے اُردو میں

شامل کئے اور کچھ ایسے انداز سے اُنھیں ملایا کہ زبان آج بھی چٹخارے لے رہی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ بات پیدا کی کہ ہندی محاوروں کے ساتھ ایرانی استعاروں کو ملاکر ریختہ بنایا۔

سودا کو ہر علم میں ایسی دستگاہ تھی کہ جس فن کا بیان کیا یا جس علم کا ذکر کیا اُس کی تمام اصطلاحیں نہایت خوبصورتی سے شامل کردیں اور اس حیثیت سے اُن کی جس قدر ہجویں ہیں بہت زیادہ قابلِ قدر ہیں۔ قصائد کے میدان میں اگرچہ پہلا ہی قدم اُٹھایا تھا مگر ایسی شان اور شکوہ کے ساتھ اس منزل کو طے کیا کہ فصاحت اور بلاغت نے قدموں کی بلائیں لیں۔

یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں کہ اس میدان میں بڑے بڑے شہسواروں سے اُنھوں نے مقابلہ کیا اور اس مقابلے میں صرف اُن کے پیچھے ہی نہیں رہے بلکہ بہت زیادہ آگے بڑھ گئے۔ بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ وہ انوری و خاقانی سے کچھ آگے تھے اور مضامین کی لطافت و نزاکت کی حیثیت سے عرفی اور ظہوری سے اُن کا رتبہ کسی طرح کم نہ آتا۔ موجودہ فضا میں اس بات پر زبان کھولنا کہ اُن کی زبان کیسی تھی، بیکار بات ہے۔ زبان ہمیشہ زمانے کے ساتھ بدلتی رہتی ہے زمانے کی ترقیوں نے اس دُنیا میں ایک عجیب انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

قدیم شاعری کے طریقے کا صحیح بدل جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا پیدا نہیں ہوا ہے نہ کسی طرح سے اس کا نعم البدل کہا جا سکتا ہے بلکہ دن بہ دن پستی کی جانب جُھکتا جاتا ہے۔ نظم ہو یا نثر فقط الفاظ کے در و بست پر یا خیالی سادگی پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ کل جو باتیں محاسن کلام میں داخل تھیں، آج عیوب میں شمار ہوتی ہیں۔ حقیقت طرازی کی جانب طبائع کا میلان بڑھ رہا ہے۔ پھر بھی قدیم لٹریچر کا قبضہ اور تصرّف ابھی تک بہت کچھ باقی ہے اور ملک کا مذاق ابھی بالکل نہیں بدلا۔ مگر ہَوا کی رفتار ضرور بدلی ہوئی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اس کا رُخ شاہراہ سے یقیناً پھر گیا ہے مگر آج زمانہ یہ سبق پڑھاتا ہے کہ ترقی کرنا چاہیئے لیکن ہندوستان میں جو ترقی کا تعلّق مشرقی زبانوں سے سمجھا جاتا ہے اُس کا کوئی تعلق یورپ کے موجودہ لٹریچر سے نہیں۔ اگرچہ یورپ کے بعض شعرا مشرقی شاعروں کے کلام سے آج بھی برابر استفادہ حاصل کرنے میں مشغول ہیں اور اس سے صدہا اسلوب بیان اخذ کر رہے ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان کے لوگ کس اصول اور قاعدے سے دعوے استغنائی رکھتے ہیں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ موجودہ زمانے کے بڑے بڑے انجینیر جب ہندوستان کی قدیم عمارتوں اور پرانے قلعوں کو دیکھنے جاتے ہیں تو

گھنٹوں اپنے جدید آلات کے ذریعے سے اُن کی جانچ پڑتال کر کے سبق حاصل کرتے ہیں اور جب واپس ہوتے ہیں تو اپنی ڈائریوں اور روزنامچوں کے ذریعے سے صدہا مفید نتائج سے جن کو وہ استخراج کر چکے ہیں، دنیا کو مطلع کرتے ہیں، ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے بالکل اُسی طرح موجودہ ناثر و ناظم ہندوستان کے قدیم لٹریچر سے بہت کچھ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس طرف توجہ نہیں کرتے۔

اس میں تو کوئی شک اور شبہہ کی گنجائش نہیں کہ انگریزی لٹریچر کی ترقی کا معیار کمال کی حد سے متجاوز ہو گیا ہے۔ ادبِ اُردو نے بھی کچھ قدم ضرور آگے بڑھایا ہے۔ مگر جب تک لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ کن کن چیزوں کا انتخاب ہم کو انگریزی لٹریچر سے کرنا ہے اُس وقت تک ہمارا لٹریچر کبھی ترقی نہ کر سکے گا۔

متوسطین کے طبقے میں حضرت جامیؒ کے بعد جو دَور گزرا اور جس میں وہ تمام شعراء شامل ہیں جنھوں نے شاہانِ صفویہ و مُغلیہ کے دورِ حکومت میں ایران یا ہندوستان میں امتیازی جھنڈا بلند کیا تھا۔ کون ہے جو اُن کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ وہ سب قدما کی سچّی روش کے دلدادہ ہیں اور اُن کا لوہا مانتے ہیں۔

یہ طبقہ جس کا ہم نے ذکر کیا ہے اس میں بڑے بڑے شعراء گزرے

ہیں اور جن کے کمالِ اُستادی سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔
دراصل شاعری ہو یا انشا پردازی۔ اُسے ملک کے مذاق سے الگ یا علیحدہ
ہونا ایک بیکار بات ہے کیونکہ جس طرح مختلف سانچوں میں مختلف وضع
اور قطع کی اشیاء ڈھلتی رہتی ہیں اُسی طرح نظم اور نثر کا بھی طریقہ اور
عمل ہونا چاہیے۔ اعلیٰ درجہ کا ملکۂ شاعری کسی خاص زمانے یا کسی
خاص ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اور نہ کوئی خاص خصوصیت کی وجہ
ہے۔ اور اس لئے ہم کو یہ سمجھ لینا کہ اعلیٰ درجہ کی شاعری اُس کی افضل اور
اعلیٰ قابلیت جیسی متقدمین میں ہوتی تھی متاخرین میں نہیں ہو سکتی،
یقیناً غلط ہے اور بہ امر ہر شخص تسلیم کرے گا کہ شیریں آواز کی خصوصیت
اور مصوّری کی قابلیت اعلیٰ سے اعلیٰ درجے پر ہر ہر ملک میں نمایاں ہے۔
بالکل اسی طرح ہر ملک اور ہر زمانے میں مختلف علل اور اسباب سے
مختلف صورتوں اور شکلوں میں شاعری کا بہتر سے بہتر رنگ نظر
آرہا ہے۔ غرضکہ سب سے زیادہ اور بااثر چیز فقط سوسائٹی کا مذاق
سمجھنا چاہئے۔

میر انیس جو بارھویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے تھے اور
جن میں شاعری کا خاص مذاق اور ملکہ تھا اگر چوتھی صدی ہجری میں
ایران میں پیدا ہوتے تو کچھ شبہ کی گنجائش نہیں کہ رزمیہ نظم میں وہی

درجہ اور مرتبہ پاتے جو فردوسی نے پایا تھا۔ یا فردوسی اپنی قابلیت کے لحاظ سے جو اُس نے پائی یا اُسے ملی تھی ہندوستان میں پرورش پاتا تو اس سے زیادہ قبولیت نہ حاصل کرتا۔

اس صورت میں بہ لحاظ اُن مرصّع کاریوں کے جو آج مرزا کے کلام میں نظر آتی ہیں کسی اور میں نایاب اور ناممکن ہیں مثلاً دلچسپ غزلوں کا ایسی بحروں میں ملنا جو اُردو نظم میں کسی طرح نظر نہیں آتی تھیں۔ زمین سخت اور سنگلاخ۔ ردیف اور قافیہ مشکل۔ پھر جس چیز کو جس نہج اور عنوان سے لکھ گیا وہ ایسا گتھا ہوا کہ اپنی جگہ سے جنبش نہیں ہوسکتی، باوجود اِن خصوصیتوں کے اُن کے دماغ میں غرور۔ نخوت۔ حسد اور کینہ۔ بغض اور عداوت، خود غرضی اور ظلم پسندی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

عبرۃ الغافلین کے آخر میں مرزا فاخر کے اشعار پر جب مرزا جھاڑ کر چکے تو لکھتے ہیں کہ:۔ ”میری غرض ان اشعار کی اصلاح سے توبہ توبہ یہ نہیں ہے کہ مجھے خدانخواستہ مرزا فاخر سے کوئی عداوت ہے بلکہ میرا مدعا اور مقصد اپنی تربیت ہے۔ اگر حق تعالیٰ سخن سنجوں کو ان اشعار کے مطالعے کا موقع دے تو میری یہ گزارش ہے کہ جس جگہ میری غلطی ظاہر ہو مجھے ضرور مطلع کریں تاکہ میں بھی متنبہ ہو جاؤں۔ اگر

میری رائے صحیح ہے تو نومشقوں کے لئے یگین کی پیروی مضر اور
ناواجب ہے۔ یگین نے بھی اُستادانِ مسلم الثبوت پر غلط اور فضول
گرفت کی ہے اور اصلاح دی ہے۔ ظاہرا اُنکا مقصد بھی اصلاح سے
وجہ عداوت نہ تھی بلکہ غرض اور غایت اُن کی بھی یہ تھی کہ اُستادانِ
فن شاعری اور مسلم الثبوت کو بھی نہیں مانتے اور اس سے قبل جو لوگ
اُستادی کے درجے پر پہنچ چکے ہیں اُنھوں نے بھی اپنی عمر کا بڑا حصہ
عیب جوئی میں صرف کیا۔ خود میں نے بھی اپنی عمر کے سینتالیس سال ریختہ میں
گنوائے اور آج بھی اپنے کلام کو اعتراض سے پاک وصاف نہیں
خیال کرتا اور جس کو اُستاد مسلم الثبوت سمجھتا ہوں اُس کے سامنے
زانوئے ادب تہ کر کے بیٹھ جاتا ہوں تا کہ کچھ نہ کچھ مجھے ضرور حاصل ہو جائے۔
اگر کوئی نومشق بھی میرے شعر پر صحیح گرفت کرے تو میں تسلیم کرنے پر
تیار ہوں۔ سخن سنجی کا یہ مرتبہ ہے کہ اس فن کے دائرے میں کوئی شخص
بھی اصل مرکز پر نہیں پہنچ سکتا یعنی عبارات رنگین بوستان بے خزاں ہیں اور
الفاظ مناسب اس گلستان کے درخت ہیں مگر شرط یہ ہے کہ زمین شعر
میں مناسب جگہوں پر قرینے قرینے سے نصب ہو سکیں اور معنی برجستہ
کی تمثیل باغ کے شیریں پھلوں سے دیجا سکتی ہے۔ زمزمہ سنجانِ سخن
کی تشبیہہ حدیقۂ بلبل سے مکمل ہوتی ہے۔ اب اگر غور کی نظر سے

دیکھا جائے تو بعض وقت باغبان سبزۂ بیگانہ کو صحنِ باغ سے نکال کر باہر پھینک دیتا ہے اور بعض وقت اُسی سبزے میں آبیاری کرتا ہے اور بغیر اس صورت کے باغ کی آرائش و زیبائش ناممکن ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح فنِ شاعری میں بغیر ان موزونیوں کے شاعری غیر موزوں۔ بھدی۔ بدنما۔ پھیکی نظر آتی ہے"۔

اگر کوئی شخص اس امر کو پیشِ نظر نہیں رکھتا ہے تو اُس کا کلام بالکل اُس طوطے کی طرح ہے جو حق اللہ پاک ذات اللہ، سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اور جو یہ بھی نہیں سمجھتا کہ اس کے کیا معنی ہیں۔

غرضکہ مرزا کی طبیعت کی مناسبت اور مشق کی کثرت نے دہلی جیسے شہر میں خواص تو تھے ہی عوام سے بھی اپنی اُستادی کا کلمہ پڑھوا لیا اور گھر گھر، گلی گلی، عام و خاص کی زبان پر اُن کی غزلیں چڑھ گئیں۔ کلام کا شہرہ یہاں تک بڑھا کہ شاہِ عالم نے اپنا کلام اصلاح کے لئے بھیجا اور برابر غزلیں بھیجنے لگے۔ ایک دن کسی غزل کے لیے شاہ عالم نے تقاضا کیا۔ مرزا نے عذر کیا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ کتنی غزلیں روزانہ کہہ لیتے ہو۔ مرزا نے کہا پیر و مرشد جب طبیعت لگ جاتی ہے تو دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔ بادشاہ نے کہا کہ ہم تو پاخانے میں بیٹھ کے تین چار غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کی، ویسی ہی

تو بھی تو آتی ہے اور یہ کہہ کر چلے آئے۔ بادشاہ نے پھر کئی بار بلایا اور کہا غزلیں بناؤ۔ ہم تمھیں ملک الشعراء کر دیں گے مگر پھر یہ نہ جانا تھا نہ گئے۔ اور کہلا بھیجا کہ حضور کی ملک الشعرائی سے کیا ہوتا ہے کریگا تو میرا کلام۔ اور دل شکستہ ہو کر بیٹھ رہے اُس وقت قدر دانوں کی کمی نہ تھی۔ بہت سے لوگ موجود تھے کچھ پروا نہ ہوئی۔ بہت سے اُمرا و رؤسا اور خاص طور پر مہربان خاں اور نصیب خاں خواجہ سرا برابر امداد کرتے رہے۔ دل شکستگی سے شگفتگی پیدا ہو گئی۔ شدہ شدہ مرزا کی شہرت کی خبر نواب شجاع الدولہ کے کانوں تک پہنچی "برادر شفیق" لکھ کر کمال اشتیاق سے مع سفر خرچ خط بھیجا۔ دہلی چھوڑنا مرزا کو بعض مصالح سے گوارا نہ تھا، جواب میں فقط اس رباعی پر حسنِ معذرت کو ختم کیا۔

رباعی

سوداِ پئے دنیا تو بہ ہر سو کب تک   آوارہ ازیں کوچہ باں کو کب تک
حاصل یہی نہ اس سے کہ دنیا ہووے   بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

کئی سال کے بعد جب قدر دان باقی نہ رہے۔ زمانے کا رنگ اور سے کچھ اور ہو گیا۔ تو سودا بہت گھبرائے۔ اُس وقت ایسے تباہ شدہ اشخاص کے لئے دو ہی جگہیں تھیں۔ لکھنؤ یا حیدر آباد۔ لکھنؤ قریب تھا، جہاں فیض و سخا کا آبشار گرا کرتا تھا۔ جو دہلی سے نکلتا تھا اُدھر ہی کا رُخ

کرتا تھا اور مالا مال ہو جاتا تھا۔ اس وجہ سے کسی دوسری طرف خیال بھی نہ جاتا تھا۔ حاکم اور محکوم دونوں جویائے کمال تھے، ایک ایک نقطے کو کتابوں کے مول خرید لیتے تھے۔ غرضکہ ساٹھ یا چونسٹھ برس کی عمر میں مرزا دہلی سے نکل کر چند روز فرخ آباد میں نواب بنگش خاں کے پاس رہے اور ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہنچے۔

مصنف آب حیات نے سچ لکھا ہے کہ مرزا کی طبیعت ایک رنگ کی پابند نہ تھی۔ ہمیشہ نئے نئے قافیے جس پہلو سے جمتے دیکھتے جما دیتے اور اُن میں ضرور کوئی ایسا پہلو ہوتا تھا جو سننے والے کو خواہ مخواہ بھلا معلوم ہوتا تھا۔ یہ بھی زبان کی بڑی خوبی تھی کہ جو بات اُس سے نکلتی تھی اُس کا انداز نیا اور بھلا معلوم ہوتا تھا۔

اُن کے ہمعصر اور اس فن کے اور اُستاد مقر تھے کہ جو باتیں کاوش اور تلاش سے ہم پیدا کرتے ہیں وہ اُس شخص کے لئے بالکل پیش پا اُفتادہ ہیں۔ اُنھوں نے فارسی محاوروں یا استعاروں سے ہندی زبان کو بہت زور بخشا اور اُن میں کے اکثر رواج پا گئے۔ اُنھیں کے زور طبیعت کا یہ نتیجہ تھا کہ اُس کی نزاکت سے دو زبانیں ترکیب پا کر ایک تیسری زبان پیدا ہو گئی۔ اور اُس کی مقبولیت اس درجہ بڑھی کہ آئندہ کے لئے وہی ہندوستان کی زبان قرار پا گئی، حکام کی زبانوں پر

درباروں اور علوم کے خزانوں پر اُس نے قبضہ کیا اور ہماری زبان انشا پردازی اور فصاحت کا تمغہ لیکر شایستہ زبانوں کے دربار میں عزت کی کُرسی پا گئی۔ بھلا ایسی طبیعتیں کہاں ہوتی ہیں کہ پسندِ عام کی نبض شناس ہوں اور وہی بات پیدا کریں جن پر قبولیتِ عام فریفتہ ہو کر سالہا سال کے لئے رواج عام کا قبالہ لکھ دے۔ چونکہ ہر زبان کے اہلِ کمال کا طریقۂ عمل ہے کہ غیر زبانوں کے بعض الفاظ میں اپنے محاورے کا کچھ نہ کچھ تصرف کر لیتے ہیں۔ اس میں کسی کسی موقع پر قادر الکلامی کا زور دکھانا پڑتا ہے کسی جگہ پر محاورۂ عام کی پابندی مطلوب ہوتی ہے۔ مرزا نے بھی کہیں کہیں اس قسم کے تصرفات کئے ہیں۔

ساقِ سیمیں۔

فارسی کا محاورہ ہے۔ مرزا سودا نے اُسے یوں باندھا ہے۔

ساقِ سیمیں کو تری دیکھ کے گوری گوری　　شمع مجلس میں ہوئی جاتی تھی تھوڑی تھوڑی

زلفِ سیہ فام

فارسی کا محاورہ ہے

بہت ہر ایک سے ٹکرا کے چلا تھا کالا　　ہو گیا دیکھ کے وہ زلفِ سیہ فام سفید

عاجز دل

سودا تجھے کہتا ہوں نہ خوبوں سے مِل اتنا　　تو اپنا غریب عاجزِ دل بیچنے والا

نامراد

عاشق بھی نامراد ہیں پر اس قدر نہیں دل کو گنوا کے بیٹھ رہے صبر کر کے ہم

مرزا اکثر ہندی الفاظ کو نہایت لطیف طور پر تضمین کر کے ہندی زبان کی اصلیت کا پورا حق ادا کرتے تھے۔

بلبلِ نالاں وہ دردِ عشق کچھ معقول ہے سانس لے سکتے نہیں ایسی برہ کی سول ہے
اے دل یہ کس سے بگڑی کہ آئی ہے فوجِ اشک لختِ جگر کی لاش کو آگے دھرے ہوئے

مرزا کو الفاظ کے تراشنے میں خاص ملکہ تھا اور اس خوبصورتی سے تراشتے تھے کہ فوراً مقبول ہو جاتے تھے۔

سحر و صولت کے سامنے تیرے سامری بھول جائے اپنی پڑھنت

مصنفِ آبِ حیات نے مرزا کے حالات پر روشنی ڈالی مگر مرزا کے شباب و جوانی کے حالات بالکل نہیں بیان کئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی بڑی فردگزاشت کے کیا وجوہ تھے، اس لئے کہ آبِ حیات جس وقت لکھی گئی اُس وقت مرزا کے بچپن اور شباب پر روشنی ڈالنا اس قدر دقت طلب نہ تھا جس قدر آج ہے۔ سب سے بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ مصنفِ ادبِ اُردو۔ آبِ بقا۔ ادب الشعراء۔ گلستانِ سخن۔ بزمِ سخن۔ شمیمِ سخن۔ خمخانۂ جاوید۔ سراپا سخن۔ شعرالہند۔ طورِ کلیم۔ گلشنِ بیخار۔ گلدستۂ ادب۔ گلِ رعنا نے بھی مرزا کے بچپن کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔

صرف آبِ حیات میں ایک واقعہ لکھا ہے جس سے مرزا کی موزونی طبع کا پتہ سال کھلتا ہے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ میر جعفر جن کا تخلص زٹل تھا شام کے وقت ایک رنگین جریب ہاتھ میں لئے ہوئے گھر سے نکلے اور مرزا بھی بغل میں کتابوں کا جزدان دبائے سامنے سے آ رہے تھے۔ اُس زمانے میں چونکہ ہر چھوٹا اور بڑا ادب کا بہت پابند تھا۔ بزرگوں کو سلام کرنا اور اُس کے بدلے میں دعا لینا ایک نعمت اور سعادت سمجھتا تھا۔ مرزا نے میر صاحب کو جھک کر سلام کیا۔ اُنھوں نے خوش ہو کے دُعا دی۔ مرزا بچپن ہی سے موزونِ طبع کا شہرہ حاصل کر چکے تھے اور جگہ جگہ اس کا چرچا ہوا کرتا تھا۔ میر صاحب نے پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں۔ مرزا ساتھ ہو لئے۔ میر صاحب نے نوخیز طبیعت کو بڑھانے کے لئے کہا کہ بھلا اس مصرع پر مصرع تو لگاؤ۔

لالہ در باغ داغ چوں دارد

مرزا نے سوچ کر جواب دیا "عمر کوتاہ و غم زدل دارد" میر صاحب نے کہا کہ دن بھر کے بھوکے تھے (ہ) کھا گئے۔

اس پر مرزا نے دوسرا مصرع لگایا

"در غم عشق سینہ خوں دارد"

میر صاحب نے کہا کہ واہ بھئی واہ۔ دل خون ہوتا ہے۔ جگر خون ہوتا ہے۔ سینہ کب خون ہوتا ہے۔ اس پر مرزا نے پھر ذرا فکر کی اور کہا ع

"چہ کند سوزشِ دروں دارد"

میر صاحب نے کہا ہاں مصرع تو ٹھیک ہے، مگر طبیعت پر زور دیکر کہو۔ مرزا دق ہو گئے اور کہا "یک عصا سبز...... دارد۔ میر صاحب ہنس پڑے جریب اٹھائی اور کہا ہم سے بھی کھلی بازی۔ دیکھ تیرے باپ سے کہونگا کہ "بازی بازی باریشِ بابا ہم بازی" مرزا لڑکے تھے بھاگ کھڑے ہوئے۔

مرزا کے مزاج میں شوخی اور ظرافت کا مادّہ ضرورت سے زائد تھا اور اسی کے ساتھ زود رنجی بھی جزوِ مزاج ہو گئی تھی اور اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ بے اختیاری میں بغیر ہجو لکھے ہوئے ان کے دل کی بھڑاس نکلتی ہی نہ تھی۔ غصّے میں مزاج کی گرم گرم اور تیز تیز شعاعیں بجائے اعتدال پر آنے کے اور تیز ہو جاتی تھیں جس کے سامنے بادل کی گرج اور بجلی کی چمک پھیکی پڑ جاتی تھی۔ تنکے کو پہاڑ سوئی کو بھالا بنا دینے میں ذرا بھی پس و پیش نہ ہوتا تھا۔ اس صورت میں ان کی آتش بیانی سے بچنا مشکل اور دشوار ہو جاتا تھا۔

مرزا کا ذکر مختلف تذکروں میں موجود ہے۔ ہم یہاں پر چند

تذکروں کا اقتباس درج کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ مرزا کی نسبت ہمارے اُردو تذکرہ نویسوں کی کیا رائے ہے۔

گلستانِ بیخزاں کی رائے

مؤلفِ گلستانِ بےخزاں یا نغمۂ عندلیب نے مرزاؔ کے حالات پر یوں روشنی ڈالی ہے:۔

سوداؔ تخلص۔ سجدہ گاہ شعرا و مسجود الشعرا۔ افصح الفصحا۔ بلند مقام میرزا محمد رفیع نام۔ کابل نژاد۔ تولد اور نشوونما کا شاہجہاں آباد مقام۔ عین جوانی میں لکھنؤ کی ہوا دل میں آئی بعد عرصۂ دراز وہیں وفات پائی۔ قرب یافتۂ درگاہِ وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر۔ اُستادِ بے بدل۔ علم سخندانی میں جمیع شعرائے عصر سے سبقت لے گئے اور اُستاد نے لیت و لعل۔ خوبی طبیعت سے خوبانِ خلخ و نوشاد شرمندہ۔ اندازِ طبعِ نظم کا انداز خوش محبوبان بندہ ذائقۂ چاشنیِ فکر اُن کی زنبورِ عسل چکھے تو دکان قنادی آبِ حسرت میں بہے۔ نیسان گہربار فکر سے سمندر سخن میں وہ قطرہ ٹپکے اور صدفِ کاغذ میں وہ موتی آبدار بیش بہا پیدا ہوئے کہ کسی شہنشاہِ سخن نے اپنے جدِ بزرگوار کی زبان

اور اپنے کان سے اُن کا نام بھی نہ سُنا ہوگا۔ اِس فن کے اُستادوں نے ایسا مضمون فی عمرہٖ کبھی بچشمِ خیال سے خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ اُن کے دریائے خوض نے ایسی موجیں ماریں کہ قلزم عمق میں حشمہائے حباب دیکھ ہاریں۔ کلام اُن کا وہ نخل ہے کہ ثمر اس کا مزہ اثمار اشجار خلد کا دیتا ہے۔ ایک ایک مصرع موزوں سے شاخِ طوبےٰ کیفیتِ فضائے بہشت لیتا ہے۔ خنجرِ مصرع کا جو زخم کھائے تو ہر مرتبہ مزہ شہدِ شہادت کا پائے۔ اور نشانِ زخم نظر نہ آئے تو کسی کو کیا دکھائے۔ روشنی شمعِ فکر اُن کی اور مشعل وادیِ ایمن ایک دودمان سے ہیں۔ طائرِ مضمون اور طوطیِ سدرے ایک آشیانے سے ہیں۔ مرغِ مضمون شاخِ مضارع پر اس رنگ سے نواسنج۔ جس کی نغمہ پردازی سے بُلبُلِ ہزار داستان کو رنجؔ طوطیِ تصویرِ سخن گُلدستۂ کاغذ پر اس وجہ سے دستان سرا ہے کہ مسیحِ عندلیب باوصف اعجاز گوئی گُنگ بے سروپا ہے۔ دامِ ابیات میں مرغانِ مضامین بہ ہزار شوق شکار ہوتے ہیں۔ اگر مرقع بہزاد میں تصویرِ عیسیِ مضمون خامۂ جادو نگار لکھے تو ہر تصویر ذی روح اور گویا ہوکر محوِ حیرت ہو رہے۔

کلام اُن کا وادیِ کاغذ میں گُم گشتگانِ دشتِ سخن کو خضر ظلمات مطلب ہے۔ سخن کی اور اُن کی کثرتِ اُلفت سے ایک صورت ہوگئی۔

یہی سبب ہے کو قصیدہ غزل سے بہتر ہے، پر غزل جو بہتر قصیدے سے نظر حقیر میں۔ غزل چشمۂ خورشید۔ اور قصیدہ جوئے شیر سے سفید۔ امکان نہیں کہ شعر غزل میں بے لطف ہوں اور قصیدہ میں بےکیف ایک ایک سے بہتر۔ اس پر عدو عیب لگائے ہزار حیف۔ طبع نیاز مند کو کلام انکا نہایت پسند۔ مذاق معنی سے خواہش شوق خرسند۔ اگر عنانِ کمیتِ کلک طرف ساحت صفت پھیرے تو مگس کو ہما سے افضل تر بناتا اور جو باگ شب رنگِ قلم سمتِ عرصۂ ہجو معطوف کی تو عنقا کو پشّے سے کمتر کر دکھاتا۔ صاحبِ گلشنِ بے خار کو کیا ہوا ہے جو سودا کے باب میں یہ فقرہ لکھا ہے "مرزا از اقسامِ شاعری در مثنوی ذکرِ معقول نہ داشت الخ" صاحبو جس شخص کو یہ قدرت حاصل ہو کہ جس طرف کو طبیعت دل مائل ہو تو یہ تو آفتابِ طبع سے مہر کو سائے سے بدتر کر دکھائے۔ جودتِ فکر سایۂ دیوار کو رشکِ ظلِّ ہما بنائے۔ کیا مثنوی نہ کہہ سکے کیونکر جی رہ سکے۔ کلیات میں ایک مثنوی دیکھنے میں آئی۔ واہ۔ اللہ اللہ سبحان اللہ! کیا کیا شعر اُس میں لکھے ہیں کہ اُن کی کیا تعریف ہو۔ کس زبان سے اُن کی توصیف ہو۔ غرضکہ وصف اُس کا جس قدر کہ کیجئے زیبا۔ سودائے سخن شاہ سخن شاہ حاتم سے خریدا اصفر امزاجانِ سابق کو سودائے شعر اس دم سے دیا۔ سوداغ

اُٹھانے والے محبت کے جو دعوے سخن کرتے ہیں اُن سے یوں کلام کیا۔

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا　　موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہِ طور کا

مجھ صید ناتواں کے احوال کو نہ پوچھو　　محروم ذبح سے ہوں مردود ہوں قفس کا

اسقدر بنت العنب سے دل ہی سودا کا بھرا　　زخم نے دل کے نہ دیکھا منہ کبھی انگور کا

اِتنا ہے تو یوسف سے مشابہ کہ عدم کے　　پردے میں چھپا اُسکے تئیں مجھ کو نکالا

اپنا ہُنر دکھائیں گے ہم تجھ کو شیشہ گر　　ٹوٹا ہوا کسی کا اگر ہم سے دل بنا

کمالِ بندگیِ عشق ہے خداوندی　　کہ ایک زن نے شہِ مصر سا غلام لیا

سودا غزل چمن میں تو اب ایسی کہہ کے لا　　گُل سُن کے پھاڑیں جیب تو دیں بلبلیں صدا

گُل مست کہیو باغ میں اے عندلیبِ زار　　غنچے کا دل دہن پہ کسی کے بکھر چلا

سمندر کر دیا لوگوں نے آخر اُسکو کہہ کہکر　　ہوئے تھے جمع کچھ آنسو مری آنکھوں سے بہ بہ کر

مرقد پہ مری موجِ نسیم آئے تو بہ جان　　دیوانہ تہِ خاک ہے زنجیر ہوا پر

میں اور عندلیب ازل سے ہیں غم نصیب　　مجھ پر ستم ہوا ہے تو اُس پر جفائے گُل

بھلا گُل تو تو ہنستا ہے ہماری بے ثباتی پر　　بتا روتی ہے کس کی ہستیِ موہوم پر شبنم

نوک سے کانٹوں کے ٹپکے ہی لہو اے باغباں　　کس دل آزردہ کے دامن کش ہیں خارِ چمن

ہنوز آئینہ گرد اس غم سے اپنے مُنہ کو ملتا ہے　　خدا جانے کہ کیا کیا صورتیں اس خاک میں گڑیاں

فکرِ معاش۔ عشقِ بتاں۔ ذکرِ رفتگاں　　اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

مَے پرستی ہے مری باعثِ آمرزشِ خلق　　توبہ صد قوم نے کی ہے مری غمخواری سے

اِتنی ہے بعدِ مرگ بھی پاسِ شکستِ دل　　ٹوٹے نہ آئینہ مرے سنگِ مزار سے

غفلت میں زندگی کو نہ کھو گر شعور ہے یہ خواب زیرِ سایۂ بالِ طیور ہے

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

خمخانۂ جاوید کی رائے

مؤلف خمخانۂ جاوید لکھتے ہیں کہ :-

سودا شہسوارِ عرصۂ معانی رشکِ انوری وخاقانی طرۂ دستارِ فصاحت۔ غازۂ رخسارِ بلاغت۔ ملک الشعرا مرزا محمد رفیع ابنِ مرزا محمد شفیع دہلوی ۱۱۲۵ھ میں مردِ میدانِ سخن کی ولادت ہوئی۔ مؤرخین انھیں کابل نژاد کہتے ہیں مگر اصل یہ ہے کہ خاکِ شاہجہاں آباد اُن کے خمیر میں شامل ہوئی۔ شاعر نامور نے شاہ حاتم کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ میر سوز۔ میر درد۔ میر تقی میر سے معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں، جس مبارک فن نے اُن کے نام کو زندہ کیا اُس کی ابتدا اِسی فنِ شاعری سے ہوئی۔ مگر افسوس یہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ ابنائے زمانہ کی ناقدری سے عین شباب میں لکھنؤ چلے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطنتِ مغلیہ کے درخت میں دیمک لگ چکی تھی صوبہ داران

کا مزاج شمیم اقبال سے مہک رہا تھا۔ لکھنؤ میں وزیر الممالک نواب آصف الدولہ کا دور دورہ تھا۔ ہندوستان کے ہر گوشے سے پریشان حال اور تباہ روزگار مسلمان اِدھر ہی کا رُخ کرتے اور یا قسمت یا نصیب کہکر لکھنؤ میں وارد ہوتے۔ مرزا سوداؔ بھی دہلی سے روانہ ہو کر مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ قدردانوں اور ذی کمالوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ چند ہی دنوں میں نواب وزیر تک رسائی ہو گئی۔ آصف الدولہ تو ایسے ذی جوہر سپاہی منش شرفا کی تلاش ہی میں رہتے تھے، اُن کی بڑی آؤ بھگت کی۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ نواب شجاع الدولہ نے خود اُنھیں لکھنؤ بلایا تھا مگر اُس وقت یہ آ نہیں سکتے تھے۔ یہ بھی دمدمۂ ہزاری لائے تھے۔ عزت کے آگے دولت کو پست خیال کرتے تھے۔ ملک الشعرا کا خطاب دوبارہ شاہ عالم سے حاصل ہو چکا تھا۔ چھ ہزار کی جاگیر بھی معاش کے لئے مرحمت ہوئی۔ عیش و آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ نواب وزیر کی تعریف میں نئے نئے رنگ کے قصیدے لکھے، خوب زورِ طبع دکھایا۔

طور کلیم کی رائے

مؤلف طور کلیم کا بیان ہے کہ :-

مرزا رفیع را انچہ حضرت شیفتہ در ترجمہ اش نگاشتہ ایں بندہ را خیلے خوش آمد۔ بنا بریں کلمۂ چند نقل برداشتم۔ نظر افروز ارباب مطالعہ باد۔ وہو ہذا بزعم فقیر غزلش بہ از قصیدہ و قصیدہ اش بہ از غزل۔ واگر گوئی غزلش از اشعار پر مملوست و قصیدہ ازاں خالی زیادہ ازیں چہ تواں گفت کہ قدما را مانند فصحاے متاخرین پیرامونِ خاطر و جاگزینِ دل نہ ایں بود کہ ہر شعر دل پذیر آمد و ہر بیت خاطر نشین لہٰذا در کلام ایشان رقص الجمل واقع شدہ چہ در قصیدہ چہ در غزل۔ پس بنا بریں مقدمات بریں بزرگان دار و گیر زنہار سزاوار نیست و طعن و تعرض لائق نہ۔ معہذا در اشعار منتخب ایشاں باید نگریست کہ درجۂ رتبت عالی و مکانتِ فخیم جلوۂ ظہور گرفتہ۔

"اشعار"

آدم کا جسم جبکہ عناصر سے مل بنا | کچھ آگ بچ رہی تھی اُسی سے یہ دل بنا

بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہو گیا | دی تھی خدا نے آنکھ سو ناسور ہو گیا

کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سوؔدا　　ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

سوؔدا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر　　اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے سے

مت پوچھ یہ کہ رات کٹی کیونکہ تجھ بغیر　　اس گفتگو سے فائدہ - پیارے گزر گئی

سوؔدا جہاں میں آ کے کوئی کچھ نہ لے گیا　　جاتا ہوں ایک میں دلِ پُر آرزو لئے

عجب بیدادِ حسرت پرمری صیّاد کرتا ہے　　دکھاتا ہے اُسے مجھ کو جسے آزاد کرتا ہے

قاصد کو اپنے ظالم جو کچھ میں دوں بجا ہے　　جیتا پھرے تو اجرت ورنہ یہ خونبہا ہے

سوؔدا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات　　آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

بدلہ ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے　　اپنا ہی سا فریفتہ ہووے خدا کرے

اتنا لکھا ئیو مری لوحِ مزار پر　　یاں تک نہ ذی حیات کو کوئی فنا کرے

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

بزمِ سخن کی رائے

بزمِ سخن میں مرزا کا ذکر اس طرح پر ہے کہ :-

سودا میر محمد رفیع ابن محمد شفیع کابلی دہلی مسکن - مردِ میدان سخنوری ہے - آفتابِ سپہر نکتہ پروری در ستایشِ اولب گشادن داد خامہ فرسائی دادن دانا دا ند یا شناسد کہ مایۂ سخن از کجا بہ کہ میرسد آرے خرداں از جہتِ ہجو و مذمّت دستارش نمی پسندند مگر ایں وجہ بلا تعصب بجاست کہ از راہِ انصاف فرسنگہا رفتند اگر ہجو و مذمّت فی نفسہٖ کارِ نیکو نشنیدہ است اقتضائے سخن فہمیست کہ ہر سخن روشِ ہمہ سخن را میگیرد - گرفتم کہ سودا گام براہِ ہجو میر نکشادہ وجادۂ مذمت ناپیما داتا دیدنی است کہ دراں بہ چہ عنوان افسونِ سخنوری دمانیدہ است -

گلشن بیخار کی رائے

گلشن بے خار میں نواب مصطفے خاں شیفتہ لکھتے ہیں کہ :-

سودا تخلص سرخیلِ شعرائے عالیمقام مرزا محمد رفیع نام اصلش از کابل مولد شاہجہاں آباد ست، بہ سنِ شباب بہ لکھنؤ رفت، وہم درانجا وفات یافت۔ از مقربانِ بارگاہِ وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر بود اُستادِ مسلم الثبوت است و در فنون سخنوری ہمہ از بیش قدم طبعش چوں عشوہ دلدانہ سراپا ناز از ہر رگ و پے نظمش می بارد۔ حلاوتِ کلامش چاشنی نوش لب شکریں شاہدانِ شیریں شمایل می دارد و فکرش چمنِ جنت است کہ گلہائے کس نہ چیدہ ازاں میخرد۔ و اندیشہ اش چشمۂ خلد است کہ جوئے شیر ازاں میریزد و ذوق کلامش ہمہ اثرِ شرابست اما نہ شرابے کہ از رگِ تاک بر آید و فروغِ خمرش ہمہ جلوۂ آفتابست اما نہ آفتابے کہ بکسوف در آید۔ طائرِ خیالش بانسرِ طائرِ ہم پرواز است و ہمائے فکرش بر ایوانِ کیوان سایہ گستر د جلوہ انداز بافنونِ شاعری مناسبت تام دارد و بر اصنافِ سخن قدرت تمام۔ وآنکہ بین الایام شہرت بہ نبر است و قصیدہ اش بہ از غزل حرفیست مہمل۔ بزعم فقیر غزلش بہ از قصیدہ است و قصیدہ اش بہ از غزل اگر گوئی کہ غزل از اشعار

پُرکن مملوست وقصیدہ ازاں خالی زیادہ ازیں چہ تواں گفت کہ قباحت
ایں تحقیق بر نظار گیان دیوانش خالی و دخلہ الیسر آنست کہ قدما را مانند
فصحائے متاخرین پیرامون خاطر و جاگزین دل نہ ایں بود کہ ہر شعر دلپذیر
برآید و ہر بیت خاطر نشین لہذا در کلام ایشان رقص الجمل واقع شدہ چہ
در قصیدہ و چہ در غزل۔ پس بنا بریں مقدمات بریں بزرگان دار و گیر
زنہار سزاوار نیست وطعن و تعرض لائق نہ۔ معہذا اشعار منتخب ایشاں
باید نہ گریست کہ درجۂ رتبت عالی و مکاتب فسیحم جلوۂ ظہور گرفتہ۔

ٹوٹے تری نگہ سے اگر دل حباب کا　　پانی بھی بھر پئیں تو مزہ ہے شراب کا

کیا کرونگا ہاتھ سے حوروں کے واعظ لیکے جام　　ہوں میں ساغر کش کسی کی نرگسِ مخمور کا

اوروں کی نسبت اندنوں کچھ ٹک چلا تھا وہ　　دو چار جھڑکیوں میں بد ستور ہو گیا

صحبتوں کا نہ کرو غیر کی مجھ سے اخفا　　کونسی شب تھی کہ میں واں پسِ دیوار نہ تھا

دل عشق کے شعلے سے جو بھڑکا تو رہا کیا　　اے جان نکل جا کہ لگی متّصل آتش

ساقی گئی بہار رہی دل میں یہ ہوس　　تم منّتوں سے جام دو اور میں کہوں کہ بس

ہے شرطِ دردیوں کو بجز حلم عندلیب　　کوئی کسی مزار پہ ہر گز نہ لائے گُل

قاتل کے دل سے آہ نہ نکلی ہوس تمام　　ذرّہ بھی ہم تڑپنے نہ پائے کہ بس تمام

کام ہے چشم کا نظّارہ نہ بہنا شب و روز　　آنکھ خالق نے رقیبوں کو دی ناسو ہمیں

کیا گلہ صیّاد سے ہم کو یونہی گزری ہے عمر　　اب اسیرِ دام ہیں تب تھے گرفتارِ چمن

ظاہر میں دیکھنے کے کچھ اسباب ہی نہیں　　آئے مگر وہ خواب میں سو خواب ہی نہیں

ساقی ہے اک تبسّمِ گُل فرصتِ بہار　　ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

کوئی جو پوچھتا ہو تو کس پر ہے داد خواہ　　جوں گُل ہزار چاک گریباں دریدہ ہیں

سخت مشکل ہے کہ ہر بات کنایہ سمجھو　　ہے زباں میرے بھی گفتار کروں یا نہ کروں

احوال مرا کہہ کہہ معشوق کیا اُس کو — اغیار تو تھے ہی تھے پر یار بہت تحفہ

پیغامبر نے دیر لگائی تو ہے ولے — دھڑکے ہے دل کہ یہ نہ کہے رات ہو گئی

ترا غرور مرا عجز تا کجا ظالم — ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ — کافی تھی تسلّی کو مرے ایک نظر بھی

کم بولنا ادا ہے ہر چند پر نہ اتنا — مُند جائے چشمِ عاشق تو بھی وہ لب نہ کھولے

بیش از ظہورِ مُرغِ چمن خادمانِ عشق — بیٹھے تھے رشتۂ رگِ گُل دام کے لئے

گُلِ رعنا کی رائے

مصنّف گُلِ رعنا لکھتے ہیں کہ :-

سودا کی ولادت ۱۱۲۱ھ میں ہوئی اور ۱۱۸۵ھ میں نواب احمد علی خاں کا انتقال ہو گیا تو مرزا برخاستہ خاطر ہو کر فیض آباد

چلے آئے تھے۔ اُس وقت اُن کا سن ساٹھ برس کا ہو چکا تھا۔ اور اس کے بعد ۱۱۹۵ھ میں مرزا کا انتقال ہو گیا۔ اس حساب سے بقول مصنّف مرزا کی عمر صرف چونتیس ۳۴ ہی سال کی ظاہر ہوتی ہے لیکن مصنّف آب حیات، خمخانۂ جاوید، بزم سخن مرزا کا سن پیدائش ۱۱۲۵ھ لکھتے ہیں اور اس حساب سے مرزا کی عمر ستّر سال کی ہوتی ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ نواب شجاع الدولہ برسر حکومت تھے بہت اعزاز سے ملے اور تنخواہ مقرر کر دی۔ شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ مسند نشین ہوئے۔ اپنی ماں بہو بیگم کی روک ٹوک سے لکھنؤ چلے آئے۔ اس کو مسند حکومت قرار دیا اور جب تک جیتے رہے نواب اور لکھنؤ کے قدر دانوں سے فارغ البال رہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ بقول آزاد ۱۱۲۵ھ میں جب مرزا لکھنؤ پہنچے تو نواب شجاع الدولہ نے بے تکلفی یا طنز سے کہا کہ مرزا تمھاری رباعی میرے دل پر ابھی تک نقش ہے۔ پھر بپاس وضعداری دربار میں نہ گئے۔ یہ سب فسانہ ہے"۔

مصنّفِ گل رعنا کے خیال میں اگر یہ واقعہ فسانہ سمجھا جائے تو ہر تاریخی واقعے کو ہر مؤلف و مصنّف بلا دلیل فسانہ کہہ سکتا ہے۔

جس وقت نواب شجاع الدولہ لکھنؤ میں رہتے تھے، اُس وقت لکھنؤ کی حیثیت ایک قصبے سے زائد نہ تھی۔ بلکہ ایک گاؤں کی سی تھی۔

اوّل تو یہ رائے ہی خلافِ قیاس و دور از فہم ہے۔ اس کے سوا جس وقت امام باڑہ آصف الدولہ کی بنیاد پڑی تھی اُس کے متعلق مختلف اور صحیح روایات آج تک مشہور و معروف اور زبان زدِ خاص و عام ہیں جس سے کسی نوع پر بھی یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ لکھنؤ کی حیثیت ایک قصبے کی تھی اور بالفرض محال اگر لکھنؤ کی حیثیت ایک قصبے سے زائد نہ بھی بلکہ ایک گاؤں کی سی تھی تو اس سے کونسا تحقیری پہلو نکلتا ہے اور اگر کوئی ذم کا پہلو نکلتا بھی ہو تو اس سے آصف الدولہ شجاع الدولہ اور مرزا رفیع السودا کے واقعات پر کونسی ذلّت کی چھاؤں پڑتی ہے۔

یہ بھی غلط ہے کہ سودا ایک بار سے زیادہ دربار نہیں گئے اور شجاع الدولہ جب تک جیتے رہے یہ اُن کے ملازم رہے"۔ اس غلطی کی ذمہ داری بھی مصنّف ہی کے سر رہی۔ کیونکہ کسی اور مصنّف نے ایسا دعوےٰ نہیں کیا۔

اِس کے بعد جو کچھ ہے وہ آبِ حیات کا مختصر خلاصہ ہے۔

آگے چل کر پھر یہ اعتراض ہے کہ مرزا رفیع السودا کے کلام میں دو قسم کی کمیاں تھیں ایک تو یہ کہ اُن کا کلام کم و بیش تصوّف کی چاشنی سے خالی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا ذوق و شوق دُنیا کے معاملات تک محدود تھا۔ دوسرے یہ کہ لطفِ غزل اُن میں کم ہے۔

یعنی غزلوں میں وہ سوز و گداز نہیں ہے۔ سُبکی و سادگی جو غزل کی جان ہے۔
اس موقع پر قابل توجہ صرف یہ امر ہے کہ آج دُنیا کا کوئی فرد اس اصول سے انکار کرنے پر تیار نہیں ہے کہ ہر انسان میں تمام صفاتِ انسانی ضرور موجود ہوتے ہیں اور تمام عیوب سے وہ بالکل پاک وصاف ہوتا ہے۔ مثلاً تقویٰ و تقدّس، رحم و کرم، علم و عقل، زور و طاقت، سخاوت و ثروت۔ اِسی طرح دلفریبی و رعنائی وغیرہ غرضکہ جملہ صفات موجود ہونا محالات ہیں۔ پس یہ ماننا پڑے گا کہ کچھ نہ کچھ کمیاں اور کوئی نہ کوئی کمزوری ہونا لازمی ہے۔ اس صورت میں تمام اصنافِ شاعری پر نظر ڈالتے ہوئے کسی فرد میں صرف دو کمیوں کا ہونا ذرا بھی تعجب انگیز نہیں ہے۔

ہم ذیل میں چند اشعار نمونتہً درج کرتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ اُن کے اشعار میں کس حد تک تصوّف و فلسفے کی کمی تھی۔

ہستی سے عدم تک نفَسِ چند کی ہے راہ — دُنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

چاہا کہ جوں حباب میں، دیکھوں یہ کائنات — کھولی جو آنکھ او رہی عالم کی سیر کی

پردے کو تیقّن کے درِ دل سے اُٹھادے　کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

دیر و حرم کو دیکھا اللہ ری فضولی　یہ کیا ضرور تھا جب دل کا مکاں بنایا

ہم دعا تو مانگیں اپنے حق میں پر ساماں کہاں　لاکھ اہلِ دل ہمیں کہنے کو آئیں چاہیے

گزرا کبھی نہ وہم میں وہ اہلِ ہوش کے　دنیا سے لطفِ زیست جو دیوانہ لے گیا

یہ چمنِ دہر میں توام ہیں سدا شادی و غم　خندۂ گُل نہ رہے گریۂ شبنم سے دور

وہ قدم جس سے رگِ گُل کو بھی ہوتی ہے خلش　سجدہ گاہِ خلق ہے یا بوسہ گاہِ خار ہے

بھاگ دیوانے سے مت اے غافل　وہیں لیلیٰ ہے جہاں مجنوں ہے

منعم نہ مر بنائے عمارت کی فکر میں　یہ سب حویلیاں تھیں جہاں تک ہے اب اُجاڑ

بہار و باغ ہو مینا ہو اور صہبا ہو　ہوا ہو ابر ہو ساقی ہو اور دنیا ہو

سادگی اور سوز و گداز کے متعلق بھی جو غزل کی جان سمجھی جاتی ہے، اعتراض ہے۔ لیکن جس کسی نے دیوان سودا کو اچٹتی نظر سے بھی دیکھا ہے اُس کا اعتراض بھی ظاہراً قابل جواب نہیں ہو سکتا۔ ذیل کے اشعار جو سادگی اور سوز و گداز سے پُر ہیں، پڑھئے۔

لختِ جگر آنکھوں سے ہر آن نکلتے ہیں　　یہ دل سے محبت کے ارمان نکلتے ہیں

ضعف سے نالہ بھی اب دل سے نہیں آسکتا　　درد لاتا ہے بہت خون جگر سے باہر

بال و پر توڑ کے سونپے ہی قفس کو صیّاد　　تجھ سے رخصت ہو مری اے ہوسِ آزادی

ہم ہیں وارستہ محبت کی مددگاری سے　　سب سے آزاد ہوئے دل کی گرفتاری سے

جفا و مہر جو خاطر میں تیری اب آئے　　وہی ہے خوب مرے حق میں جو تجھے بھائے

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف　　دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے

غنچے سمٹے تو سمٹے ممکن ہے　　دل جو بکھرے تو کب سمٹتا ہے

چہرے پہ نہ یہ نقاب دیکھا   پردے میں یہ آفتاب دیکھا

بے جُرم و گُناہ قتلِ عاشق   مذہب میں ترے ثواب دیکھا

دل تو نے عبث لکھا تھا نامہ   جو اُس نے دیا جواب دیکھا

پوچھے ہے پھول پھل کی خبر اب تو عندلیب   ٹوٹے، جھڑے، خزاں ہوئے پھوٹے پھلے گئے

جس سے پوچھا کہ یہ دل خوش ہی کبھی دنیا میں   رو دیا اُن نے اور اِتنا کہا کیا کہتے ہیں

دیکھتا ہوں میں تری بزم میں ہر ایک کا مُنہ   طلبِ رحم کی نظروں سے گُنہگار کی طرح

ہوئی ہے عمر کہ ہم لگ رہے ہیں دامن سے   جھٹک نہ دیجیو پیارے غبار کے مانند

واجب القتل تو ہم تھے ہی پر اتنی جلدی   یار تقصیر بھی اثبات نہ ہونے پائی

صبا سے ہر سحر مجھ کو لہو کی باس آتی ہے   چمن میں آہ گلچیں نے یہ کس بُلبُل کا دل توڑا

نسخہ ترے مریض کا عیسیٰ کو جو دیا دیکھ اُس نے حرف حرف کو رو رو کے دھو دیا

نگہ بمہر تبسم بہ لطف کچھ تو ہو جو وہ نہ ہو تو یہ ہو یہ نہ ہو تو وہ تو ہو

شکوہ ہی دور کرنا ظالم مروّتوں سے لبریز ورنہ دل ہے تیری شکایتوں سے

وصل کی رات ہے محروم ہیں اک بوسے کے آب حیواں میں پڑے تشنہ وہاں پھرتے ہیں

پُرزے بغیر دل کے ممکن نہیں کہ ہوئے معلوم حال میرا تیری کنایتوں سے

جو عمل چاہئے کیجے مرے دُکھ دینے کو وہ نہ کیجے کہ کہے کوئی سزاوار نہ تھا

شب تری بزم میں سودا کو میں دیکھا جب تک کچھ خموشی کے سوا اُس کو سدا کار نہ تھا

پھر یہ اعتراض ہے کہ "مرزا کے کلام کی شہرت شجاع الدولہ کے کانوں تک پہنچی تو کمال اشتیاق سے برادر من شفیق و مہربان لکھ کر مع سفر خرچ خط بھیجنا غلط ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہ طلبی کسی مُلّا، فقیر یا تکیہ دار مولوی کی نہ تھی، نہ کسی ادنےٰ درجے کے آدمی کی تحریر تھی شجاع الدولہ

بہادر کا یہ خط تھا کون شجاع الدولہ جو بادشاہِ وقت تھا۔ کیا یہ فسانہ کہا جا سکتا ہے۔ مگر مرزا کو چونکہ دلّی چھوڑنا گوارا نہ تھا اس لئے رباعی پر حُسنِ معذرت کو ختم کیا۔ جس کا مفصل حال گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

شعر الہند کی رائے

مؤلف شعر الہند اِس طرح رقمطراز ہیں کہ :۔

"قدما کے اس دور میں جس میں کہ میرؔ و مرزاؔ تھے اگرچہ ایک ہی درجے کے متعدد اساتذہ موجود تھے لیکن اُن میں صرف میرؔ و مرزاؔ حریف مقابل تسلیم کئے گئے۔ اور اُن کی شاعری کا موازنہ اور مقابلہ اُردو شاعری کی تاریخ کا ایک لازمی جزو ہو گیا۔ لیکن تاریخی حیثیت سے صحیح طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ دونوں حضرات کب حریفانہ حیثیت سے اکھاڑے میں اُترے۔ یہ یقینی ہے کہ ایک زمانے تک دونوں میں اتحاد رہا اور میرؔ صاحب سوداؔ کو اپنا شریکِ فن تسلیم کرتے رہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی
گیا ہو میرؔ دیوانہ رہا سوداؔ سا مستانہ

یہی حال سودا کا بھی تھا۔ جو ایک منظوم شکایت آمیز خط سے ظاہر ہوتا ہے۔

علی الخصوص تغافل کو میر صاحب کے کہوں میں کس سے کہ با وصف اتحاد تمام
لکھا نہ پرچہ کاغذ بھی اتنی مدت میں کہ بیقراروں میں تا ہوئے موجب آرام

نہیں معلوم کہ اس اتحاد کے بعد کیا اختلاف کے وجوہ پیش آئے کہ مرزا رجز پڑھتے ہوئے اکھاڑے میں اتر آئے۔

سودا تو اِس زمیں میں غزل در غزل ہی لکھ ہوتا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

اِس پر میر صاحب نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ؎

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یونہی سودا کا ہوتا ہے سو جاہل ہے وہ کیا جانے

تاہم مؤلف شعر الہند نے اختلاف کے کچھ بھی وجوہ نہیں بتلائے اور جو بتلائے ہیں اُن کا نہ لکھنا کہیں اچھا تھا۔ لکھتے ہیں کہ ”اس سب میں میر و مرزا کا موازنہ جس درجہ آسان ہے اُسی قدر مشکل بھی ہے“۔ بجائے اس کے اگر وہ غالب کا یہ شعر لکھ دیتے تو کہیں اچھا تھا۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

پھر اپنے ایک نکتہ داں دوست کا قول نقل کیا ہے اور اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔ ”ہمارے نزدیک انشا۔ ناسخ۔ ذوق اور میر کی طرح

سودا کو بالکل غیر فطری شاعر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے میر کے ساتھ سودا کے موازنہ کا فیصلہ آسانی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اور عام طور پر مشہور ہے اور اکثر تذکرہ نویس بھی اسی کے ساتھ ہم آہنگ ہیں کہ مرزا کو قصیدہ نگاری میں کمال ہے اور میر غزل گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اسی کے ساتھ میر صاحب کو یہ فوقیت بھی حاصل ہے کہ وہ مثنوی بہت اچھی لکھتے ہیں۔ اس لئے دونوں کے راستے الگ الگ ہیں اور اسی لحاظ سے یا تو ان دونوں کا موازنہ نہیں ہو سکتا یا ہو سکتا ہے تو نہایت آسانی کے ساتھ۔ اگر ان تصریحات سے قطع نظر کر کے ان دونوں بزرگوں کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو دونوں میں کوئی نمایاں فرق نظر نہ آئیگا۔ قدما کے طور پر جو محاسن ہیں وہ دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ غزل گوئی کا داخلی پہلو دونوں برتتے ہیں۔ دونوں کی غزلیں جذبات و واردات سے لبریز ہوتی ہیں۔ سادہ اور لطیف تشبیہات دونوں کے یہاں موجود ہیں۔ فارسی زبان کی دلاویز ترکیبوں کو دونوں استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح اس درد کے معائب بھی دونوں کے یہاں کم و بیش موجود ہیں۔ جا بجا زبان دونوں کی فحش اور مبتذل ہے۔ کہیں کہیں سبک مضامین دونوں باندھ جاتے ہیں۔ شتر گربگی یعنی کلام کی ناہمواری دونوں کے یہاں پائی جاتی ہے۔

میر صاحب کے یہاں سودا سے پست شعر نکل سکتے ہیں بلکہ میر صاحب کے یہاں بعض اور معائب بھی سودا کے یہاں سے زیادہ نکل سکتے ہیں لیکن باوجود اس کے غزل گوئی میں سودا کو میر سے اس لئے پست خیال کیا جاتا ہے کہ سودا کی غزلوں میں تغزل کی اصلی روح یعنی سوز وگداز نہیں ہے"۔

آگے بڑھ کر ایک جگہ مؤلفِ شعر الہند لکھتے ہیں کہ اِن دونوں کا موازنہ ہو ہی نہیں سکتا اور ہو سکتا ہے تو آسانی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ یعنی مشکل سے موازنہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ وہی سہل موازنہ ہے جو زیبِ قلم ہوا ہے اور جس کی نُو وجہیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً پہلی وجہ قومی خصوصیت۔ دوسری اخلاقی مسائل۔ تیسری مضمون آفرینی اور خیال بندی۔ چوتھی داخلی پہلو کے ساتھ خارجی رنگ کو اختیار کرنا۔ پانچویں انکا زورِ طبع ایک رنگ پر ٹھہرنے نہیں دیتا تھا۔ چھٹی وہ نسبتاً میر سے مشکل زمینوں میں غزل کہتے تھے۔ اس کے سوا تین وجہیں اور بھی ہیں جو بجائے خود محتاج ذکر نہیں۔ دیکھنے والے اور سمجھنے والے خود ہی نتیجہ نکال کر رائے قائم کر سکتے ہیں۔ پھر لکھتے ہیں کہ میر کی شاعری اور شہرت کا دار مدار غزلوں پر ہے اور سودا کی غزلیں اس پائے سے نیچی ہیں۔ مگر وہ قصیدے کے بادشاہ تھے، اس لئے اُن دونوں کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے

سب سے پہلے اُن کی سیرت اور خصلت پر غور کر کے رائے قائم کرنا چاہئے۔ اس لئے ظنِ غالب تو یہ ہے کہ یہ اظہار رائے سیرت اور خصلت دونوں پر لحاظ کر کے غالباً ہوا ہوگا۔ پھر لکھتے ہیں "شاعر تو فطرتاً دونوں تھے اور اپنے اپنے احساسات اور جذبات کو موزوں الفاظ میں ادا کرتے تھے۔ دونوں کی طبیعتیں جس جس سمت و رُخ پھریں اُسی طرف اُن کی شاعری کا رُخ پھر گیا۔ میرؔ نے زبان اور خیالات میں جس قدر فصاحت اور صفائی پیدا کی اُتنا ہی بلاغت کو کم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ غزل اصول غزلیت کے لحاظ سے سوداؔ سے کچھ بہتر ہے۔ اُن کا سُلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک انداز رکھتا ہے اور فکر کو، بجائے کاہش کے لذّت بخشتا ہے۔ اس وجہ سے معزز اور ہر دلعزیز تھا۔"

مؤلف نے غالباً اِسی نازک اور باریک پہلو کو پیش نظر رکھ کر یہ فیصلہ کیا ہے پھر لکھتے ہیں۔ "چونکہ مطالب کے وقت مضامین کی بلند پروازی، الفاظ کی شان و شکوہ، بندش کی چستی قصائد کے لئے لازمی چیزیں تھیں اور عموماً طبیعت کی شگفتگی اور جوش و خروش کا سبب ہوتا ہے، اس وجہ سے میرؔ کے قصائد کم ہیں۔ اُنھوں نے اہلِ فن اور اہلِ سخن پر ظاہر کر دیا کہ غزل اور قصیدے کے دو میدان ہیں جن میں دن اور رات کا فرق ہے۔ اور اِسی محل پر دونوں کی طبیعتوں کا رنگ

جدا جدا ہے۔ دوسری بڑی وجہ قصیدہ گوئی میں نہ پڑنے کی یہ تھی کہ یہ توکل اور قناعت کے عادی تھے۔ خوشامد سے نفرت رکھتے۔ خود بینی وخود پسندی اُن پر مسلّط تھی۔ کسی کی تعریف اُن کی زبان سے نکلتی نہ تھی، چنانچہ ایک مقام پر کہتے ہیں :۔

مجکو دماغ وصل وگُل و یاسمن نہیں
میں جوں نسیم بادہ فروشِ چمن نہیں

کل جاکے ہم نے میرؔ کے در پر سُنا جواب
مدت ہوئی کہ یاں وہ غریب الوطن نہیں

طبیعت خلقتاً دردمند تھی اور تمام عمر مصیبت اور فلاکت میں گزری۔ مزاج میں خودداری اور پاس وضع بیحد تھا جس نے انھیں گوشہ نشین بنادیا۔ لوگوں سے مِلنا جُلنا اپنا کلام سُنانا اوروں کا سُننا اور تعریف کرنا معیوب جانتے تھے۔ غرضکہ دنیا اُن سے نالاں تھی اور یہ دُنیا سے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہی وجہ قومی خصوصیت جو ہجوگوئی کا سبب ہے جس نے سوداؔ میں وہ عجز اور تذلّل پیدا ہونے نہیں دیا جو مسکین میرؔ کا عام شیوہ اور غزل کا اصلی عنصر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جبتک کسی شاعر میں مسکینیت نہو۔ عجز نہو۔ نہ شاعر ہو سکتا ہے نہ غزل کہہ سکتا ہے؟ کیا معنی کہ عجز اور تذلّل شاعری کا کوئی قوی جوہر نہیں ہے۔ نہ یہ ضروری ہے کہ جو شیوہ میرؔ کا تھا وہی شیوہ ہر شاعر کے لئے لازمی ہو۔ اور جس قدر شعرا موجود تھے اُن سب میں یہ رنگ موجود تھا؟ مولانا شبلیؔ

لکھتے ہیں کہ جذباتِ انسانی کو برانگیختہ کرنا شاعری ہے یعنی اُسے سُن کر رنج یا خوشی کا اثر ہو۔ یا الفاظ کے ذریعے سے جو جذبات ادا ہوں وہ شعر ہے۔

(۲) وہ تغزّل کے علاوہ اخلاقی مسائل کو لیتے ہیں اور اُن کو تمثیل کے ذریعے ثابت کرتے ہیں" اِس موقع پر بھی یہ پوچھنا پڑا کہ کیا تمثیل کے سوا کوئی اور ذریعہ بھی ممکن ہے؟

(۳) زمانے کی روش کے خلاف وہ جا بجا مضمون آفرینی اور خیال بندی بھی کر جاتے ہیں"۔ یہ امر بھی کوئی شاعرانہ نقص نہیں، نہ ابھی تک یہ پتا لگ سکا کہ شاعری میں مضمون آفرینی اور خیال بندی کو کس وجہ سے اور کس سبب سے کس سن و سال سے عیب میں داخل کر دیا گیا ہے۔

(۴) وہ داخلی پہلو کے ساتھ خارجی پہلو کو بھی لیتے ہیں اور اکثر معشوق کے خدوخال کی بے اثر تعریف و توصیف کرتے ہیں"۔ غالباً کم لوگوں نے یہ رنگ اور یہ صورت معائب میں آج تک داخل سمجھی ہو۔ اگر کسی مولوی یا ملّا کے خیال میں اس کا شمار کسی گناہ میں ہوا ہے تو اُس سے دنیا لاعلم ہے۔

(۵) اُن کا (سودا کا) زورِ طبع کسی ایک رنگ پر ٹھہرنے نہیں دیتا"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی غزلوں، قصائد۔ رباعیوں میں

ایک ہی رنگ کے مضامین کیوں باندھتے رہے۔ اگر سچ پوچھئے تو یہ امر اُن کی انتہائی قابلیت اور فن کے جامع ہونے کی بہتر اور عمدہ دلیل ہے۔

(۶) وہ میر سے نسبتاً مشکل زمینوں میں غزل کہتے تھے"۔ کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میر صاحب مشکل زمینوں میں غزل کہنے سے عاجز و مجبور تھے اور اس سے سودا کی شاعری میں کوئی ذم کا پہلو نکلنا ممکن ہے۔ ہرگز نہیں۔

(۷) پھر لکھتے ہیں اور میر صاحب کے کلام کا ایک نقص یہ زائد بتلاتے ہیں کہ "سودا میر کی طرح گوشہ نشین اور قناعت پسند نہ تھے"۔ پس سودا میں اگر یہ نقص تھا تو اُس زمانے میں اور جس قدر شاعر موجود تھے وہ بھی اِن عیوب سے پاک نہ تھے۔

(۸) پھر صفحہ ۶۴ پر لکھتے ہیں کہ "میر کا کلام بھی اگرچہ رطب و یابس کا مجموعہ ہے مگر کوئی غزل سوز و گداز سے خالی نہیں ہوتی"۔ پس یہ امر ذرا بھی تعجب خیز نہیں کہ جس شخص کی تمام عمر عجز و تذلل میں گزری ہو اُسمیں سوز و گداز کا ہونا تعجب خیز کیا ہے۔

(۹) صفحہ ۶۵ میں لکھتے ہیں کہ "ہمارے نزدیک اُن کے قصائد سے بھی سرسری طور پر گزر جانا مناسب نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس

زمانے میں جو چیزیں قصیدہ گوئی کا معیار خیال کی جاتی تھیں اُن سے اُن کے قصائد بالکل خالی ہیں۔ اُنھوں نے مشکل زمینوں میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ دھوم دھام کی تشبیہیں نہیں لکھی ہیں۔ طولانی قصائد بھی اُن کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ اُن کے یہاں عموماً الفاظ کی شان و شوکت بھی موجود نہیں

جلد دوم شعرالہند کے صفحۂ ۱۴ میں لکھتے ہیں کہ اِسی طرح کی اور بھی غلطیاں میر صاحب کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اُنھوں نے ایک غزل میں خدا اور دعا قافیہ بتایا ہے اور بیّں کو ردیف ؎

اگر ہوتا اثر میری دعا میں   لگ اُٹھتی آگ سب ارض و سما میں

پھر اِسی غزل کی ردیف میں یہ تصرّف فرماتے ہیں ؎

کفن کیا عشق میں مَیں نے ہی پہنا   کھپے لوں ہوں میں بہتیروں کے جامے

غرضکہ انصاف کی عینک سے دیکھنے والے اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ مؤلفِ شعرالہند نے میر صاحب کی تعریف بھی کی تو کس طریقے۔ انداز اور پہلو سے۔ جس میں بھی ہر طرح سے ذم کا کوئی نہ کوئی پہلو خود بخود نکلتا ہے۔ رہے سودا وہ تو پہلے ہی سے عتاب میں ہیں۔ مؤلف نے میر اور سودا کے موازنے کا جو ٹکڑا درج کیا ہے وہ بھی آبِ حیات کی نقل ہے۔

(میرؔ)

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا   دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

(سوداؔ)

بہ چمن میں صبح جو اُس جنگجو کا نام لیا   صبا نے تیغ کا موجِ رواں سے کام لیا

(میرؔ)

ایک محروم چلے میرؔ ہمیں دنیا سے   ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

(سوداؔ)

سوداؔ جہاں میں آکے کوئی کچھ نہ لے گیا   جاتا ہوں ایک میں دلِ پُر آرزو لئے

(میرؔ)

رات ساری تو کٹی سُنتے پریشاں گوئی   میرؔ جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

(سوداؔ)

سوداؔ تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات   اب آئی سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

(میرؔ)

مت ذبح کیجئے کہ یہ اپنا ہے اعتقاد   دل ڈھانے کو جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

(سوداؔ)

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ   یہ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

افسر امروہی کی رائے

امروہے کے ایک بزرگ نے دو تین سال ہوئے نگار میں سودا اور مصحفی کا تقابل کیا تھا۔ اُن کی تمامتر تنقید کا خلاصہ صرف اس قدر تھا کہ میر اور سودا میں فرق یہ ہے کہ میر کے کلام میں سوز و گداز ہے جو سودا کے یہاں بالکل کم ہے، بلکہ تقریباً مفقود ہے، اور اِسی وجہ سے سودا غزل گو شعرا کے گروہ سے باہر ہیں۔ وہ مرزا منش تھے۔ اور اُن کی مرزا منشی سے بعید تھا کہ میر کی سی مسکینیت اُن میں پیدا ہو سکے۔

اس کا عقلی جواب تو یہ ہے کہ ہر مرزا کی یہ قومی خصوصیت نہیں ہے کہ عجز اور فروتنی سے بے بہرہ ہو۔ غالب ہی کو دیکھئے کہ اُن کے کلام میں باوجود مرزائیت کے سوز و گداز کس طرح دست و گریباں ہے۔ اور غالب ہی پر کیا موقوف ہے، لاکھوں ایرانی شعرا میرزا تھے۔ اور پھر غزل گوئی میں سرآمدِ شعرائے روزگار مانے گئے ہیں۔ دوسرا نقلی جواب یہ ہے کہ سودا کے کلام میں سے بکثرت ایسے اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جو سوز و گداز سے کماحقہٗ لبریز ہیں اور جن پر میر جیسے غزل گو سر دُھنتے ہیں۔ پھر اُس پر مستزاد یہ ہے کہ اُن کے کلام میں اثر نہیں تھا۔ بہت لچر اور فضول سی بات ہے۔ اگر اُن کا کلام بے اثر تھا تو اِن بہتر خنجروں کے لئے کس

سرزمین کے انسان بلائے گئے تھے اور جس کی مثالوں سے صدیوں کے بعد بھی سفینے بھرے پڑے ہیں۔

اشعار سودا

یا جاکے اُس گلی کو جہاں تھا ترا گزر — لے صبح تا بہ شام کئی بار دیکھنا
کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں روزِ ہجر کو — پر جو خدا دکھائے سو نا چار دیکھنا
سو کھا نہ ایک پل مرادامانِ آستیں — تجھ عشق میں یہ دیدۂ خونبار دیکھنا

دل تو نے عبث لکھا تھا نامہ — جو اُس نے دیا جواب دیکھا

موجِ آتش ہے سیل آنکھوں کی — شاید اس دل کا آبلہ ٹوٹا

اگر دل لیجلاجی کی خلش مت چھوڑ سینے میں — سحر لے جا نہیں سکتا تو اُس کو شام لیتا جا

کیا ہیں کام نہ کرنے کارات ساقی سے — خدا کرے کہ ہو خانہ خراب شیشے کا

عوض ہے دل شکنی کا بہت محال اے یار — جو شیشہ ٹوٹے تو تب کیجئے جواب شیشے کا

قتل سے میرے عبث قاتل پھرا   اُس نے مُنہ پھیرا ہمارا دل پھرا

آخرِ کار اُس جگہ کیا دیکھتا ہوں رات کو   وہ مقدّس صورت اور ایسی بے ریا

نیچے جی کس طرح روزِ ازل کاتبِ قدرت نے   ہمارا خون قاتل کے دمِ شمشیر پہ لکھا

عشق کی خلقت سے آگے میں ترا دیوانہ تھا   سنگ میں آتش تھی جب تو شمع میں پروانہ تھا

میں نہ چاہوں گا کسی سے داد اپنے قتل کی   کس لئے مجھ ہاتھ سے پرواز کرتی ہے حنا

دل میں تیرے جو کوئی گھر کر گیا   سخت مُہم تھی کہ وہ سر کر گیا
آن کے شبنم کی طرح دوسرا   شام سے رو رو کے سحر کر گیا

ناصحا اُٹھ میری بالیں سے خدا کے واسطے   جان کھانی اِسکو کہتے ہیں یہ سمجھا نانہیں

سرگوشی پر تو میری آشفتہ کیوں ہوا   میں دردِ دل کہا ہے یہ کچھ اور تو نہیں

ہوا ہیں دل کو لیجانے پہ راضی تیری خاطر سے　　کہا کب تھا کہ ساتھ اُسکے مرا آرام لیتا جا

اُس مُرغِ ناتواں کی صیاد کچھ خبر ہے　　جو چھوٹ کر قفس سے گلزار تک نہ پہنچا

کیا کیا دلا کے غیرت میں ناز دل کو رکھا　　ورنہ نہ سہنی باتیں تیری میں سہ گیا تھا

ہوں تو چراغ راہِ ہُنر زیرِ آسماں　　لیکن خموش ہو کے سرِ راہ رہ گیا
ٹکڑے تو ہو گیا ہے جگر تیر کس لئے　　چلنے کا اشک کر کے سرانجام کر گیا

دیکھے بُلبُل جو یار کی صورت　　پھر نہ دیکھے بہار کی صورت
برق دیکھی ہو جس نے سو جانے　　مجھ دلِ بے قرار کی صورت
جو کوئی دیکھتا ہے روتا ہے　　مجھ دلِ داغدار کی صورت

کرتے ہیں اسیرِ قفس و دام بھی فریاد　　لے سکتے نہیں سانس گرفتارِ محبت

خاکستر اپنے سوختہ دل کی صبا کے ہاتھ　　تحفہ تری گلی کو ہے بھیجا حضورِ صبح

بیاں بدمستیٔ شب بزمِ ساقی میں جو ہو جائے   ہمیں مت کہیو کچھ مُنہ تو ہی کُھلوانا ہی شیشے کا

کس سے کروں میں دعوائے دل جا کے اے خدا   دلدادۂ زلفِ رُخ و دلبر ندیدہ ہوں

کیا جانے شیخ کعبے گیا یا بسوئے دیر   اِتنا تو جانتے ہیں کہ پیمانہ لے گیا

کرتا ہے جا کے گُل کی تسلّی چمن میں تو   خونِ جگر سے میں بھی تو دامن کشیدہ ہوں

صیاد کہہ تو کس نے کبوتر کو دام میں   سکھلا دیا ہیں دل کی مرے اضطراریاں

کاٹ کر پلٹے ہو ناگن تب اثر کرتا ہے زہر   سیکھ لی زلفوں سے تیری اُس نے بل کھانے کی طرح

مرقد پہ مرے موجِ نسیم آئے تو یہ جان   دیوانہ تہِ خاک ہے زنجیر ہوا پر

کیا جانئے کہ اُس سے کہیگا وہ کس طرح   مجھ کو پیامبر کی ہے گُفتار کا خلش

طاقت نہیں ہے اِتنی کہ بے طاقتی کروں   موجب مرے سکوت کا آرام کچھ نہیں

اے شیشہ گرانِ دل کوئی ٹوٹا جو بنادے　　پیدا کرے پھر اور ہی کچھ شیشہ گری رنگ

جنسِ دل کتنی ہے ناکارہ ببازارِ بتاں　　ایک پوچھے لوں تو بولے دوسرا کس کام کو

موسمِ گل ہے ولے کچھ یہ دل اب شاد نہیں　　تابِ پرواز نہیں طاقتِ فریاد نہیں

قاتل سے کیوں جھگڑتے ہو کیا مجھ سے بیر ہے　　جائے خطر نہیں ہے مرا زخم خیر ہے

گزر مرا ترے کوچے میں گر نہیں تو نہ ہو　　مرے خیال میں تو لاکھ بار گزرے ہے
سمجھ کے قطع کر اب پیرہن مرا خیاط　　نظر سے چاک کے یاں تار تار گزرے ہے
ہزار حرف شکایت کا دیکھتے ہی تجھے　　زباں پہ شکر ہو بے اختیار گزرے ہے

کہے ہے آج ترے در پہ اضطرابِ نسیم　　کہ اس جہاں سے کوئی خاکسار گزرے ہے
میں وہ نہیں کہ کوئی مجھ سے مل کے ہو بدنام　　نہ جانے کیا تری خاطر میں یار گزرے ہے
مجھے تو دیکھ کہ جوش و خروش سودا کا　　اسی ہی سوچ میں فصلِ بہار گزرے ہے

ظالم کر اب انصاف کہ سینے میں کہاں سے　　ہر دم کے لہو پینے کو پارہ جگر آئے

جو اُٹھ نہ سکے تری گلی سے — رہنے دے کہ تا غبار ہوئے
ناصح تو قسم لے ہم سے دل پر — اپنا کبھو اختیار ہوئے
کن زخموں میں زخم ہے کہ جبتک — چھاتی کے نہ وار پار ہوئے

یہاں تک آپ مرزا کے حالات مختلف قلموں سے نکلے ہوئے پڑھ چکے۔ اس سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مرزا کا مرتبہ اِن تذکرہ نویسوں کی نگاہوں میں کس قدر تھا۔ چونکہ نیرنگ سودا میں ہمیں مرزا کے پایہ کی دوسری ہستی کو پیش کرنا ہے اس لئے ہم مختصر طور پر میر تقی میر کے حالات کو بھی قلمبند کئے دیتے ہیں۔ اِس سے ناظرین کو اپنی رائے قائم کرنے میں بہت آسانی ہو جائے گی۔
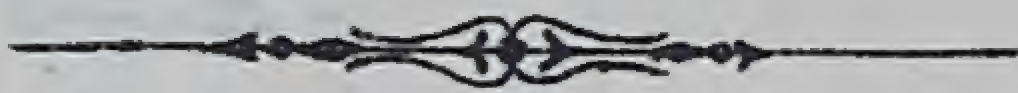
میرؔ کے حالات اور میرؔ کی شاعری

ولادت اکبر آباد ۱۱۲۵ھ وفات لکھنؤ ۱۲۲۵ھ

میرؔ صاحب عرب سے احمد آباد گجرات ہوتے ہوئے ہندوستان آئے اور اکبر آباد میں مستقل قیام کیا۔ میرؔ صاحب کے باپ خلوت پسند تھے۔ درویشی کی جانب طبیعت کا میلان زائد تھا۔ شاہ کلیم اللہ نام ایک بزرگ جو اُس وقت میں اولیاء اللہ خیال کئے جاتے تھے۔ اُن کی خدمت میں زیادہ رہنے لگے اور ریاضت کی جانب متوجہ ہو گئے اور ساری عمر اِسی حال میں گزار دی۔ نام اُن کا عبداللہ تھا۔ شرفائے اکبر آباد سے تھے۔

میرؔ صاحب کی تعلیم اور تربیت سید احسان اللہ کی نگرانی میں ہوتی رہی۔ اُن کی عمر کا ابھی پچیسواں سال تھا کہ باپ نے انتقال کیا۔ مزاج میں قدرتاً حیا تھی اور طبیعت غیور واقع ہوئی تھی۔ دستِ سوال دراز کرنے کے لئے غیرت اجازت نہیں دیتی تھی توکل پر فقط قناعت تھی۔ جب مصائب اور تکلیفوں نے زیادہ نرغہ کیا

تو آگرے کا قیام محال بلکہ ناممکن سمجھے۔ اُس کو خیر باد کہہ کر دہلی کا رُخ کیا۔

اُس زمانے میں صمصام الدولہ امیر الامرا کا طوطی بولتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح گھس بیٹھکر اُن تک رسائی پیدا کی اور بمد روزینہ داران ایک روپیہ روزانہ مقرر ہو گیا۔ ادھر سلطنت نے پھر پلٹا کھایا۔ بادشاہ سے جنگ چھڑ گئی۔ صمصام الدولہ قتل ہوئے۔ میر صاحب پر پھر مصیبت آئی پریشانیوں نے دھاوا بول دیا۔ کوڑھ میں کھاج اُس پر بیماریوں نے بھی آ دبایا۔ اُس وقت یہ مصیبت سب سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ غرضکہ بڑی پریشانیوں کے بعد خدا خدا کر کے بیماریوں سے نجات ملی۔ جان بچی لاکھوں پائے۔

اس مدّت میں اور بہت سے نئے ملاقاتی بھی پیدا ہو گئے تھے۔ جنھوں نے کچھ نہ کچھ تھوڑا بہت امداد کا سہارا کر دیا۔ دوسری طرف شاعری کی لذّتوں سے بہت کچھ آشنا ہو چکے تھے۔ فکر کرنے لگے اور شاعر بن گئے۔ شعرا کے گروہ میں اُن کا شمار ہونے لگا۔

اُسی زمانے میں رعایت خاں کے ساتھ زندگی کی بہتر گھڑیاں گزارنے لگے۔ مگر طبیعت میں اتفاق سے دو چیزیں جزوِ فطرت بن چکی تھیں۔ ایک نازک مزاجی۔ دوسری بدمزاجی۔ غرضکہ زمانے کی نیرنگیوں نے یہ اور گُل کھلایا کہ رعایت خاں سے اَن بَن ہو گئی۔ پریشانیوں نے

پھر اب ڈیرا خیمہ ڈالا۔ اس پر طرّہ ملازمت بھی جاتی رہی۔ مجبوراً خانہ نشینی اختیار کرنی پڑی۔ دہلی میں کلام کی مقبولیت بہت بڑھ چکی تھی۔ سخن فہم اُن کے کلام کو باہر کے لوگوں کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ شاہ عالم کے دربار میں بھی اچھی خاصی عزّت تھی۔ اُس وقت لکھنؤ کے نوابوں کا زمانہ ترقی پر تھا اور اہلِ کمال دور دور سے آکر مالا مال ہوتے تھے۔ میرؔ صاحب بھی پینتالیس۴۵ سال کی عمر میں لکھنؤ پہنچ گئے۔ سرائے میں ٹھہرے کیسی جگہ مشاعرہ تھا۔ اُنھیں بھی اطلاع ہوئی۔ غزل لکھی۔ شرکت کی غرض سے مشاعرے میں گئے۔ جس وقت مشاعرے میں داخل ہوئے تو میرؔ صاحب کی وضع اور قطع دیکھ کر اکثروں نے وطن پوچھا اکثر مسکرائے۔ میرؔ صاحب نے جواب میں کہا :-

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ہمکو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

میرؔ صاحب اپنی ناموری و شہرت اور خداداد حُسنِ قابلیت کی وجہ سے خوب اچھی طرح مشہور ہو چکے تھے۔ سخن فہم اور سخن شناس نواب آصف الدولہ نے بڑی عزّت اور احترام سے دربار میں داخل کیا اور دو سَو روپئے ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔

اب شومیِ قسمت اور بدنصیبی دیکھئے کہ میر صاحب کی نازک مزاجی نے پھر گُل کھلایا اور یہ آصف الدولہ سے خفا ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔ ادھر آصف الدولہ نے انتقال کیا۔ نواب سعادت علی خاں تخت نشین ہوئے اور اُدھر انھوں نے دربار جانا بھی چھوڑ دیا۔ نہ کسی نے اُنھیں پھر بلایا نہ یہ گئے۔

ایک روز نواب کی سواری نکلی۔ یہ تحسین کی مسجد پر سرِ راہ بیٹھے تھے۔ سواری سامنے سے نکلی۔ لوگ تعظیم کے لئے کھڑے ہوئے مگر میر صاحب نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔ سید انشا خواصی میں تھے۔ نواب نے انشا سے پوچھا کہ یہ کون تھا جس کی بدماغی اور تمکنت نے اُسے اُٹھنے بھی نہ دیا۔

انشا نے عرض کیا کہ وہی گدائے متکبّر میر ہے جس کا حضور میں ذکر آیا ہے۔ گزارے کا وہ حال۔ مزاج کا یہ رنگ۔ آج بھی فاقے ہی سے ہوگا۔ سعادت علی خاں نے واپس آکر ایک بیش بہا خلعت اور ایک ہزار روپیہ نقد دعوت کا بھجوا دیا۔ جب چوبدار لے کر گیا۔ میر صاحب نے یہ کہکر واپس کیا کہ مسجد میں بھجوائیے۔ گنہگار اِتنا محتاج نہیں ہے۔

سعادت علی خاں یہ جواب سُن کر متعجب ہوئے۔ مصاحبین نے نواب کو بہت کچھ سمجھایا۔ غرضکہ دوبارہ سیّد انشا نواب کے حکم سے خلعت لے کر گئے اور یہ سمجھایا کہ بادشاہِ وقت کا ہدیہ ہے اِسے قبول

فرمائیے۔ اگر اپنے حال پر نہیں تو عیال کے حال پر رحم کیجئے۔ میر صاحب نے کہا کہ وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں۔ میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں۔ کوئی ناواقف اس طرح پیش آتا تو مجھے شکایت نہ تھی۔ وہ مجھ سے واقف میرے حال سے واقف۔ اتنے دنوں کے بعد ایک دس روپے کے خدمتگار کے ہاتھ خلعت بھیجا۔ فقر و فاقہ قبول مگر یہ ذلت گوارا نہیں ہے۔

غرض سید انشا کی لفاظی اور لسانی کے سامنے میر صاحب کی کچھ نہ چلی۔ خلعت قبول کرنا پڑا۔ خیالات نے پلٹا کھایا۔ وحشت کم ہوئی اور کبھی کبھی دربار بھی جانے لگے۔ سعادت علی خاں اُن کی حد سے زیادہ خاطر کرتے تھے۔ سامنے بیٹھنے کی اجازت اور پیچوان پینے کو دیا۔

ایک روز لکھنؤ کے چند اراکین میر صاحب سے ملنے آئے کہ میر صاحب کے اشعار سُنیں۔ دروازے پر آواز دی۔ لونڈی باہر آئی حال پوچھ کر واپس گئی۔ ایک بوریا لاکر بچھا دیا اُنھیں بٹھایا اور پُرانا حُقہ تازہ کر کے سامنے رکھ کر چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد اندر سے میر صاحب تشریف لائے۔ مزاج پُرسی وغیرہ کے بعد اُن لوگوں نے اشعار کی فرمائش کی۔

میر صاحب نے پہلے تو بہت ٹالا پھر صاف جواب دیدیا کہ قبلہ میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔

اگرچہ اُن لوگوں کو یہ امر بہت زیادہ ناگوار گزرا مگر بخیال اخلاق و آداب اپنی نارسائی طبع کا اقرار کرلیا۔ اور پھر درخواست کی۔ میر صاحب نے پھر انکار کیا۔ آخر اُن لوگوں نے ناگواری کے لہجے میں کہا کہ حضرت ہملوگ انوری اور خاقانی کا کلام سمجھتے ہیں آپ کا کلام آخر کیوں نہ سمجھیں گے۔ میر صاحب نے کہا یہ تو بہت درست ہے مگر اُن کی شرحیں اور مصطلحات اور فرہنگیں موجود ہیں اور میرے کلام کے لئے فقط محاورہ اہلِ اُردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں۔ اور آپ اس سے محروم۔ یہ کہہ کر ایک شعر پڑھا۔ ؎

عشق بُرا ہے خیال بُرا ہے چین گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا صبح گیا یا شام گیا

اور کہا کہ آپ بموجب اپنی کتابوں کے کہیں گے کہ خیال کی (ی) ظاہر کرو پھر کہیں گے کہ (ی) تقطیع سے گرتی ہے، مگر یہاں اس کا جواب صرف اِسی قدر ہے کہ محاورہ یونہی ہے۔

میر صاحب کی زبان صاف، روزمرّہ سُتھرا اور صاف، کلام سُلجھا ہوا۔ ساری عمر غم اور مصیبت میں گزری۔ حسرت، مایوسی، ناکامی کا دُکھڑا ہمیشہ روتے رہے۔ جو کچھ کہتے تھے آپ بیتی۔ اِسی وجہ سے کلام پُر تاثیر تھا۔ اِن سب باتوں سے بڑھ کر خلقتاً اُنکی طبیعت دردمند تھی۔

میرؔ صاحب نے شکایتِ زمانہ کی بابت جو شہر آشوب کہے ہیں اور اُن میں بعض کے نام بھی لکھے ہیں مگر اُن میں اس قدر رمز و ریاں ہیں کہ جو نہ لکھنے ہی کے برابر ہے۔ واسوخت کے موجد بھی آپ ہی تھے۔ جس کی عمر کا بڑا حصّہ ہجر ہی میں گزرا ہو اور وصال کبھی نصیب ہی نہ ہوا ہو۔ تیغِ عشق کا کاری زخم خوردہ ہو اور عمر بھر زخم مندمل ہی نہ ہوا ہو اُسے واسوخت لکھنا ہی چاہیئے تھا اور واسوخت لکھنے پر حقیقتاً وہ مجبور بھی تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ تذکرہ نویس اُس قصّے کو جو شاید کسی زمانے میں راز تھا اپنی لاعلمی کی وجہ سے شاید صاف لکھ بھی نہ سکے یعنی میرؔ صاحب اکبر آباد میں ایک حسین عزیزہ سے درپردہ عشق رکھتے تھے۔ بالآخر وہ راز طشت از بام ہوا ہی چاہتا تھا۔ عزیز و اقربا کی بدنامی کے خیال سے مجبوراً وطن کو خیرباد کہنا پڑا اور بلا خیال خانہ بربادی لکھنؤ چلے آئے اور بہ صد حسرت و جانکاہی جلاوطن و حرماں نصیبی دیدارِ یار و دیارِ معشوق سے کنارہ کش ہوئے اور جب تک زندہ رہے دیوانگی کی بیڑی اور محبت کا طوق پڑا رہا۔ اور اِسی وجہ سے اِن کے کلام میں دردانگیزی اور عاشقانہ رنگ زائد نظر آتا ہے۔ کیا معنی کہ جس کسی نے ہزاروں اُمیدوں کو اِسی حسرت میں خاک میں ملا دیا ہو اُس کیلئے

سِوا واسوخت لکھنے کے چارۂ کار ہی کیا ہو سکتا تھا اُس لئے کہ اس کوچے کے خیالات اور اُس کا انداز بیان اور کسی سے ادا ہونا تو دشوار بلکہ ناممکن تھا۔

زبان کی شستگی میں شک اور شبہہ کی گنجائش نہیں۔ کلام کی صفائی کا یہ حال کہ جیسے باتیں کر رہے ہیں۔ خیالات کو نظم کرنے میں کچھ ایسا طرز اختیار کرتے تھے جو ہر طبیعت کے موافق ہوتا تھا اور ہر ایک کو پسند آتا۔ محاوروں کو باتوں ہی باتوں میں ادا کر جاتے تھے اور اِسی وجہ سے اُن کے اشعار اور شعراء کے مقابلے میں بہت زائد پُر تاثیر اور با اثر ہوتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ عام شعرا اور خصوصیت کے ساتھ عاشق مزاج شعرا کی رنگین بیانیاں اور بلند پروازیاں اُن کے مبالغے اُن کا جوش و خروش دنیا کو معلوم نہیں۔ مگر میر صاحب کے لئے اپنی قسمت کا نشتر کہو یا غم اور مصیبت جو ساتھ لائے تھے اُسی کا دُکھڑا عمر بھر لاپتے رہے جو آج بھی دلوں پر اپنا پورا اثر ڈالے بغیر نہیں رہتا۔

عام شعرا کے یہاں ایسے مضامین خیالی ہوتے ہیں مگر اُنکے یہاں تمام و کمال حالی تھے۔ ہم نے بخیال اس کے کہ زمانے کا رنگ بدل رہا ہے، میر کی شاعری کا انتخاب نہیں کیا بلکہ خود میر نے جو

انتخاب کیا تھا اُسی کو لکھدیا ہے۔

سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا ۔ جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوستہ پیکاں تیر کا

عید آئندہ تک رہے گا گِلا ۔ ہو چکی عید تو گلے نہ مِلا

ہم اسیروں کو بھلا کیا جو بہار آئے نسیم ۔ عمر گزری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا

دل میں بھراز بسکہ خیالِ شراب تھا ۔ مانند آئینے کے مرے گھر میں آب تھا

فغاں مجھ مست میں بھر خندۂ قلقل نہوئیگا ۔ مے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لیکے رویگا

کہاں آئے میسّر مجکو تجھ سے خود نما اِتنے ۔ بحُسنِ اتفاق آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا

شب زخمِ سینہ اوپر چھڑکا تھا میں نمک کو ۔ ناسور تو کہاں تھا ظالم بڑا مزا تھا

قابو خزاں کا ضعف سے گلشن میں بن گیا ۔ دوشِ ہوا پہ رنگِ گُل یاسمن گیا

دیر و حرم میں کیونکہ قدم رکھ سکوں میں میر　　مجھ سے اُدھر تو بت پھرے اودھر خدا پھرا

جبکہ تابوت مرا جائے شہادت سے اٹھا　　شُعلۂ آہ دلِ گرم محبت سے اُٹھا

عمر گزری مجھے بیماری ہی رہتی ہے بجا　　دل عزیزوں کا اگر میری عیادت سے پھرا

پل میں جہاں کو دیکھتے میرے ڈبو چکا　　اک وقت میں یہ دیدہ بھی طوفان رہ چکا

اک چشمکِ پیالہ ہے ساقی بہارِ عمر　　جھمکی لگی کہ دَور یہ آخر ہی ہو چکا

اک قطرہ خون ہو کے مژہ سے ٹپک پڑا　　قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں مآب کا

پائمالِ صد جفا ناحق نہ ہو اے عندلیب　　سبزۂ بیگانہ بھی تھا اس چمن کا آشنا
بلبلیں رو رو کے یوں کہتی تھیں ہوتا کاشکے　　یک مژہ رنگِ فراری اس چمن کا آشنا

مت پوچھ کس طرح سے کٹی رات ہجر کی　　ہر نالہ میری جان کو تیغِ کشیدہ تھا

سنو ہو جل کے بجھونگا کہ ہو رہا ہوں میں — چراغ مضطرب الحال صبح گاہی کا

خاک میں مل کے سبز اب سمجھے — بے ادائی سے آسماں کی ادا

مت ڈھلک مژگاں سے میری اے سرشکِ آبدار — مفت ہی جاتی رہیگی تیری موتی کی سی آب

تاک کی چھاؤں میں جو مست پڑے رہتے ہیں — اینٹھتی ہیں نگہیں سایۂ مژگاں کے بیچ

چل گُل ہوائے آہ میں تو جا کے لوٹیو — صحنِ چمن میں آئے پریزاد تیرے بعد

ہم تو اسیرِ کنجِ قفس ہو کے مر چلے — اے اشتیاقِ سیرِ چمن تیری کیا خبر

پاس رہنے کا نہیں ایک بھی تار آخر کار — ہاتھ سے جائے گا سررشتۂ کار آخر کار

دیکھوں میں اپنی آنکھوں سے آوے مجھے قرار — اے انتظار تجھ کو کسی کا ہو انتظار

ساقی تو ایک بار نہ توبہ کو میری توڑ — توبہ کروں جو پھر میں تو توبہ ہزار بار

بھاگے مری صورت سے وہ عاشق ہیں اُسکی شکل پر　　میں اُس کا خواہاں یاں تلک وہ مجھ سے بیزار اسقدر

اشک کے گریۂ مستانہ پہ مت کیجو نگاہ　　دامنِ دیدۂ گریاں ہے مرا پاک ہنوز

باقی نہیں ہے دل میں یہ غم ہے بجا ہنوز　　ٹپکے ہے خون دم بدم آنکھوں سے میری تا ہنوز

بارہا چل چکی تلوار تری چال پہ شوخ　　تو نہیں چھوڑتا اس طرز کی رفتار ہنوز

منتظر قتل کے وعدے کا ہوں اپنے یعنی　　جیتا مرنے کو رہا ہے یہ گنہگار ہنوز

اے ابرِ تر تو اور کسی سمت کو برس　　اس ملک میں ہماری ہی یہ چشم تر ہیں بس

یوں گنواتا ہے دل کوئی۔ مجھ کو　　یہی آتا ہے بار بار افسوس

آج کل کا ہی کو بتلاتے ہو گستاخی معاف　　راستی یہ ہے کہ وعدے ہیں تمہارے سب خلاف

سب پہ روشن ہے کہ شب مجلس جب آتی ہے شمع　　تجھ بھبھوکا سی کو بیٹھا دیکھ بجھ جاتی ہے شمع

فصلِ خزاں میں سیر کی ہم نے بھی جائے گُل　　پھانی چمن کی خاک نہ تھا نقشِ پائے گُل

گُل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بُلبُل　　یک مُشتِ گُل پڑے ہیں گُلشن میں جائے بُلبُل

آستاں پر ترے گزر گئی عمر　　اِسی دروازے کے گدا ہیں ہم
تیرے کوچے میں تا بہ مرگ رکھا　　کُشتۂ منّتِ وفا ہیں ہم

ہمچشم ہے ہر آبلۂ پا کا مرا اشک　　ازبسکہ تری راہ میں آنکھوں سے چلا ہوں
آتے ہیں مجھے خوب یہ دونوں ہُنرِ عشق　　رونے کے لئے آندھی ہوں کڑھنے کو بلا ہوں

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہ گیں نہیں　　اس غمکدے میں آہ دلِ خوش کہیں نہیں

اب فائدہ سُراغ سے بُلبُل کے باغباں　　اطرافِ باغ ہوں گے پڑے مُشتِ پر کہیں

تری زلفِ سیہ کی یاد میں آنسو چمکتے ہیں　　اندھیری رات ہے برسات میں جگنو چمکتے ہیں

اللہ ری عندلیب کی آوازِ دل خراش　　جی ہی نکل گیا جو کہا اُس نے ہائے گُل

بھلا تم نقدِ دل لیکر ہمیں دشمن گنواب تو   کبھی کچھ ہم بھی کر لیں گے حسابِ دوستاں در دل

کیا بلبلِ اسیر ہے کہ بے بال و پر کہ ہم   گل کب رکھے ہے ٹکڑے جگر جس قدر کہ ہم

جیتے ہیں تو دکھا دینگے دعوٰے عندلیب   گل بِن خزاں میں اب کے وہ رہتی ہے سر کہ ہم

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم   لیک لگ چلنے کو بلا ہیں ہم

دامن نہ جھٹک ہاتھ سے تیرے کہ ستمگر   ہوں خاکِ سرِ راہ کوئی دم میں ہوا ہوں

سُن گوشِ دل سے اب تو سمجھ بے خبر کہیں   مذکور ہو چکا ہے مرا حال ہر کہیں

کہا میں نے رو کر فشارِ گریباں   رگِ ابر تھا تارِ تارِ گریباں

دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں   اب ہم نے بھی کسی سے آنکھیں لڑائیاں ہیں

مرے آگو نہ شاعر نام پا دیں   قیامت کو مگر عرصے بہں آ دیں

نہ اک یعقوبؑ رویا اس الم میں — کنواں اندھا ہوا یوسفؑ کے غم میں

سینۂ پُر داغ کا احوال میں پوچھوں ہوں نسیم — یہ بھی تختہ کبھی ہو ویگا سزاوارِ چمن

عاشق ہے یا مریض ہے پوچھو تو میر سے — پاتا ہوں زرد روز بروز اُس جوان کو

آہ اور اشک ہے سدا ہی یہاں — روز برسات کی ہوا ہے یہاں

نسیمِ مصر کب آئی سوادِ شہرِ کنعاں میں — کہ پھر جھولی نہ یاں سے لے گئے گُل ہائے حرماں کو

گُل و سُنبل ہیں نیرنگِ فصاحت سرسری گزری — کہ بگڑے زلف و رُخ کیا کیا بناتے ہیں گلستاں میں

کیا میر اس خرابے کا بہت اب چل کے سو رہیئے — کسی دیوار کے سایئے میں مُنہ پر لیکے داماں کو

جب سے جہان میں ہے سحر نیری کردوں ہوں جستجو — خانہ بہ خانہ در بدر کوچہ بہ کوچہ کو بہ کو

دلِ پُرخوں ہے یاں تجھ کو گمان ہے شیشہ — سچ کہوں مست ہوا تو ہے کہاں ہے شیشہ

اس اسیری کے نہ کوئی اے صبا پالے پڑے　　اک نظر گل دیکھنے کے بھی ہمیں لالے پڑے

چمن پر نوحہ زاری سے ہے کس کا عام یہ ماتم　　جو شبنم ہے تو گریاں ہے جو بلبل ہے تو نالاں ہے

چمن کا نام سنا تھا ولے نہ دیکھا ہائے　　جہاں میں ہم نے قفس ہی میں زندگانی کی

لیتا ہی نکلتا ہے مرا لختِ جگر اشک　　آنسو نہیں گویا کہ ہیرے کی کنی ہے

گرم ہیں شور سے تجھ حسن کے بازار کئی　　رشک سے جلتے ہیں یوسفؑ کے خریدار کئی

مرے دردِ دل کا تو یہ جوش ہے　　کہ عالم جوانِ سبہ پوش ہے

اچھا ہے اگر چپکا رہوں مجھ پر عتاب آئے　　وگر قصہ کہوں اپنا تو سننے اس کو خواب آئے

ملوں کیونکہ ہمرنگ ہو تجھ سے ظالم　　ترا رنگ شعلہ مرا رنگ کاہی

اب خدا مغفرت کرے اس کو　　میر مرحوم تھا عجب کوئی

سبھوں کے خط لئے پوشیدہ قاصد آج جاتا ہے چلا ہے یار کے کوچے کو اور مجھ سے چھپاتا ہے

میر جب سے گیا ہے دل تب سے میں تو یہ کچھ ہو گیا ہوں سودائی

بیکلی مارے ڈالتی ہے نسیم دیکھیے اب کے سال کیا ہوئے

خانقہ کا تو نہ کر قصد ٹک اے خانہ خراب یہی اک رہ گئی ہے بستی مسلمانوں کی

نہیں وسواس جیو گنوانے کا ہائے رے ذوق دل لگانے کا

میرے تغییرِ حال پر مت جا اتفاقات ہیں زمانے کے

غافل ہیں رہا تجھ سے نپٹ تابہ جوانی اے عمرِ گزشتہ میں تری قدر نہ جانی

مدّت سے ہیں اک مشتِ پر آوارہ چمن میں نکلے ہے یہ کس کی ہوسِ بال فشانی

کیونکہ کہیے کہ اثر گریۂ مجنوں میں نہ تھا گرد نمناک ہے اب تک بھی بیابانوں میں

آتش کے شعلے سر سے ہمارے گزر گئے　　بس اے شبِ فراق کہ گرمی میں مر گئے

شب خواب کا لباس ہے عریاں تنی میں یہ　　جب سوئیے تو چادرِ مہتاب تانیے

تبر عمداً بھی کوئی مرتا ہے　　جان ہے تو جہان ہے پیارے

سودا کی بابت میر کی رائے

"مرزا رفیع کہ المتخلص بہ سودا ست، جوانے است خوش خلق، خوش خوئے، گرم جوش، یار باش، شگفتہ روئے، مولد او شاہجہان آباد است، نوکری پیشہ، غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمّس و رُباعی، ہمہ را خوب میگوید۔ سرآمدِ شعرائے ہندی اوست، بسیار خوشگو است، ہر شعرش طرفِ لطف رستہ رستہ در چمن ہندی الفاظش گُل و معنی دستہ دستہ ہر مصرعِ برجستہ اش سروِ آزاد و بندہ بیش فکرِ عنانیش طبعِ عالی شرمندہ۔ شاعرِ ریختہ، ملک الشعرا ریختہ اور اشاید۔ قصیدہ در ہجو است گفتہ تضحیک روزگار دور از حدِ مقدور۔ در او صفت ہائے بسیار بردہ۔ مطلعش اینست۔ سے

(مطلع)

ہے چرخ جب سے ابلقِ ایّام پر سوار　　رکھتا نہیں ہے دستِ عنانِ بیک قرار

اکثر اتفاقِ غزل باہم می اُفتد، از مغتنماتِ روزگار است حق تعالیٰ سلامت دارد۔ از وست۔

سودا کے کلام کا انتخاب میر کے قلم سے

سودا قمارِ عشق میں شیریں ہے کوہکن　　بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس مُنہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشقباز　　اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

نہ کھینچ اے شانے اِن زلفوں کو یاں سودا کا دل اٹکا　　اسیر ناتواں ہے یہ نہ دے زنجیر کا جھٹکا

بہ رہے رہ برقِ خارِ آشیاں تیرے سے کہتا ہوں　　اُڑیگا دھجیاں ہو کر ترا دامن جو یاں اٹکا

سودا ہوا ہے عاشق کیا پاس آبرو کا　　سُنتا ہے اے دِوانے جب دل دیا تو پھر کیا

موجِ آتش ہے سیلِ آنکھوں کا　　دل کا شاید کہ آبلہ پھوٹا

نہ جیا تیری چشم کا مارا نہ تری زلف کا بندھا چھوٹا

پھرے ہے شیخ یہ کہتا کہ میں دنیا سے مُنہ موڑا الٰہی ان نے اب ڈاڑھی بڑھا کس چیز کو چھوڑا

جو گزری ہم پہ مت اس سے کہو ہوا سو ہوا مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

ترا جیو مجھ سے نہیں ملتا مرا دل رہ نہیں سکتا غرض ایسی مصیبت ہے کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا

ترے آگو بجز آنکھوں سے آنسو کیونکہ چلتے ہیں جو تو دریا پہ گزرے ہے تو پانی بہ نہیں سکتا

ٹوٹے تری نگہ سے اگر دل حباب کا پانی بھی پھر پیوں تو مزہ ہے شراب کا

موجِ نسیم کر دے آلودہ ہے نپٹ دل خاک ہو گیا ہے کسی بیقرار کا

کس طرح تری راہ میں گھیروں کہ کوئی سدِّ رہ ہو نہ سکے عمر چلے جانے کا

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ پائی کا کہ جس نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

تجھ بن عجب معاش ہے سودا کا ان دنوں — تو بھی ٹک اسکو جا کے ستمگار دیکھنا
نے حرف نے شکایت و نے شعر نے سخن — نے سیرِ باغ نے گل و گلزار دیکھنا
یا جا کے اُس گلی میں جہاں تھا ترا گزر — لے صبح تا بہ شام کئی بار دیکھنا
تسکینِ دل نہ اس سے بھی پائی تو بہرِ شغل — پڑھنا یہ شعر گہہ کبھی اشعار دیکھنا
کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں غیر تیرے پاس — پر جو خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

کسی دیندار و کافر کا خیال اتنا نہیں آتا — سحر کیا ہو چکی سودا جیو پر شام کیا ہوگا

سودا سے یہ کہا میں دل اس طرح سے کھونا — کہنے لگا کہ ناداں کیا پوچھتا ہے ہونا

سودا سے یہ میں پوچھا میں دل بھی دوں کسی کو — وہ کر کے بیاں اپنی روداد بہت رویا

کیوں اسیری پر مری صیاد کو تھا اضطراب — کیا قفس آباد ہووے ہو گئے گلشن خراب

عشرت سے دو جہاں کی یہ دل ہاتھ دھو سکے — تیرے قدم کو چھوڑ سکے یہ نہ ہو سکے

جس سرزمیں پہ جا کے روؤں تیری یاد میں — دہقان کچھ زمیں پہ بجز دل نہ بو سکے

نہ ضرر کفر کو نے دین کا نقصاں مجھ سے — باعثِ دشمنیِ گبر و مسلماں مجھ سے

آگیا رات کو یوں دزدِ حنا تیرے ہاتھ — ورنہ جا پاؤں کو لاگا ہی تھا چوری چوری

تجھ تیغ تلے کہہ تو رستم سے کہ سر دھر دے — پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے و ہر مردے

دل کے تئیں اک عالم کہتا ہے خدا کا گھر — اے عشق اِسے آتش دے تو تو سمجھ کر دے
کہنے تو لگا ہے دل جوں غنچہ ہمارا ہے — لیکن نہ صبا تجھ سے گا ہے بدے سر دے

سینے کو رستموں کے نگہ تیری توڑ دے — آنکھوں کی ہر پلک صفِ محشر کو توڑ دے

مرجاں کا نخل ہوں نہ پھلوں برگ و بار سے — نکلے ہمیشہ خون مری شاخسار سے

خنجر طلب ہے مرگ سے ہر آہوئے حرم — دل پھر گیا ہے کس کی مژہ کے شکار سے

زاہد چلا ہے کعبے کو اور برہمن کنشت — بندے ہیں اس کے ہم جو کسی دل میں گھر کرے
جگ میں شراب خواری کی تشہیر کے لئے — سودا جو محتسب ہو تو زاہد کو خر کرے

دولاب کی ہے حق بہ طرف حقے سے فریاد — بہ بہانہ کسی کے گلے کا ہار نہ ہووے ہا
ہو دستِ خدائی میں تو یہ کیجئے فریاد — ظالم ہو جو کوئی تو طرحدار نہ ہووے
کر ذبح شتابی مجھے صیّاد کہ یہ صید — ہاتھوں ہی میں تیرے کہیں مردار نہ ہووے

میں کہتا ہوں دل اپنے سے نہ ننگ و نام سے گزرے — نہ ہوں گر اسمیں یہ باتیں تو کیا آرام سے گزرے

مومن نہیں زنّار سے میرے آگاہ — اس رشتہ کو ہے سبحۂ اسلام سے راہ

اس بُت کا برہمن ہو کر صوفی یا شیخ — کہتے ہیں جسے دیکھ کے اللہ اللہ

اس دردِ دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو — قسمت میں جو لکھا ہو الٰہی شتاب ہو

دل کے ٹکڑے کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں — کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

بہارِ باغ ہو، مینا ہو، جامِ صہبا ہو — ہوائے ابر ہو، ساقی ہو اور دُنیا ہو

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا مجھے — اے الفتِ چمن ترا خانہ خراب ہو

روا ہے کچھ تو بھلا اے سپہرِ نا انصاف   ریا سے زُہد چھپے رازِ عشق رسوا ہو

جو مہربان ہیں سودا کو مغتنم جانیں   سپاہی زادوں سے ملتا ہے دیکھیے کیا ہو

الٰہی ہے سکت نعم البدل کے تجھ کو دینے کی   مجھے اس کا عوض تو کچھ نہ دے پر پھیر لے دل کو

بوؤں میں تخمِ دل کو جہاں واں زقوم ہو   پالوں جو عندلیب قفس میں تو بوم ہو
اپنے چمن کو فائدہ کیا تجھ سے اے نسیم   یہ جا ہے وہ کہ یاں دمِ عیسیٰؑ سموم ہو

کعبے کی زیارت کو اے شیخ میں پہنچوں نگا   مستی سے مجھے بھولی جس دن رہِ میخانہ

مرے ہنس مرے رونے پر ایجان میں کہتا ہوں   ٹپکے ہے ابھی قطرۂ آہ اثر آلودہ

نسیم بھی ہے چمن میں اور اب صبا بھی ہے   ہماری خاک سے پوچھو کچھ اب رہا بھی ہے

قدم سنبھال کے رکھ خارِ دشت پر مجنوں   کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

سودا جہاں میں آکے کوئی کچھ نہ لے گیا جاتا ہوں ایک میں دلِ پُر آرزو لئے

غیرتِ عشق آن کر سودا تو پروانے سے سیکھ شمع سے اپنا ہی جلنا دیکھ جل جاتے ہیں وہ

کس قدر اپنے ہوا مست ہے پروانے کی کسی لڑکے کو نہیں سُدھ کسی دیوانے کی

سودا کو جرمِ عشق پہ کرتے ہیں آج قتل پہچانتا ہے تو یہ گنہگار کون ہے

بدلہ ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے

اس حال کی ہنسی کا کچھ اسلوب نہیں یہ کج روشی ہم سے فلک خوب نہیں

کہتا تھا بنا گوش تری زلف کے آگے ہیں صبح قیامت ہوں مری شام یہی ہے

قاصد کو اپنے ظالم جو کچھ کہ دوں بجا ہے جیتا پھرے تو اُجرت ورنہ یہ خونبہا ہے

پہنچی نہ آہ تجھ کو مرے حال کی خبر قاصد گیا تو اُن نے بھی کچھ اپنی ہی کہی

ہندو ہیں بُت پرست مسلماں خدا پرست — میں پوجتا ہوں اُس کو جو ہو آشنا پرست

کل رخصتِ بہار تھی شبنم صفت میں اور — رویا ہر ایک گُل کے گلے لگ چمن کے بیچ

یا تبسّم یا نگہ یا وعدہ یا گا ہے پیام — کچھ بھی اے خانہ خراب اِس دل کو سمجھانے کی طرح

منعم نہ مر بنائے عمارت کی فکر میں — یہ سب حویلیاں تھیں جہاں تک ہے اب اُجاڑ

کتنا شگفتہ رو ہے کہ مانندِ آرسی — چھاتی کے جس کے اوپر کھُل جاتے ہیں کواڑ

گزری جس غم سے مجھے زندگیِ دہ روزہ — رکھے اُس غم کو خدا شہرِ محرم سے دور

عقل نے ایک دن آکر یہ کہا سوداؔ سے — خواہ نزدیک ہمارے ہو خواہ ہم سے دور

لیکن اِتنا ہے کہ وہ کام نہ کیجو پیارے — جس کے باعث سے رہو تم دلِ عالم سے دور

انکارِ قتل سے تو کرے ہے سخن ہنوز — میلا نہیں ہوا ہے ہمارا کفن ہنوز

کس کے ہیں زیرِ زمیں دیدۂ نمناک ہنوز　　جا بجا سوت ہے پانی کی طرح خاک ہنوز

سودا کا تو نے حال نہ دیکھا کہ کیا ہوا　　آئینہ لے کے آپ ہی کو دیکھتے ہنوز

اے لالہ گو فلک نے دیے تجھ کو چار داغ　　چھاتی مری سراہ کہ اک دل ہزار داغ

کون کہتا ہے کہ مت اوروں سے ملکر مجھ سے مِل　　جسکے ملنے میں خوشی تیری ہو مِل پر مجھ سے مِل

رنگِ گل بے طرح دہکے ہے سن اے ابرِ بہار　　آشیاں میرا جو چھڑکا کہ لگتی ہے گلشن میں آگ

قاتل کے دل سے آہ نہ نکلی ہوس تمام　　ذرہ بھی ہم تڑپنے نہ پائے کہ بس تمام

تسلّی اس دِوانے کو تو جھولی کے پتّھر سے　　اگر سودا کو چھیڑا ہے تو لڑکو مول لو پھریاں

ظاہر میں دیکھنے کو کچھ اسباب بھی نہیں　　آوے مگر تو خواب میں سو خواب بھی نہیں

مجھ کو نہیں ہے دل میں مرے راہ کیا کروں　　پر بے اثر ہے عشق مرا آہ کیا کروں

بُلبُل چمن میں کس کے ہیں یہ شرابیاں ٹوٹی پڑی ہیں غنچوں کی ساری گلابیاں

نہ پوج سنگ و گُل اے شیخ اس صدا کو مان مرے صنم کی پرستش کر اور خدا کو مان

نہ غنچۂ گل کے کھلتے ہیں نہ نرگس کی کھلیں کلیاں چمن میں لیکے چمپا رہ گئی ہیں انکھڑیاں پنہاں

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں دو چار گھڑی رونا دو چار گھڑی باتیں

بُلبُلِ تصویر ہوں جوں نقشِ دیوارِ چمن نے قفس کے کام کا ہر گز نہ درکارِ چمن
نوک سے کانٹوں کی ٹپکے ہے لہو اے باغباں کس دلِ آزردہ کے دامن کش ہیں یہ خارِ چمن

جیوتک تو دیکھے یوں جو ہو کارگر کہیں اے آہ کیا کروں نہیں بکتا اثر کہیں
ہوتی نہیں ہے صبح نہ آتی ہے مجکو نیند جس کو پکارتا ہوں سو کہتا ہے مر کہیں
جادو بھرے ہیں چشم میں مت آئینے کو تو دیکھ دھڑکے ہے دل مرا کہ نہ پلٹے نظر کہیں

غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں جلوہ گر یار مرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں
جُرم ہے اس کی وفا کا کہ جفا کی تقصیر کوئی بولو تو میاں مُنہ میں زباں ہے کہ نہیں

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ میر صاحب کے حالات پر ایک نسخہ ہماری نگاہ سے گزرا جس میں خصوصیت کے ساتھ ذیل کے الفاظ درج تھے۔

میر صاحب کے قلم سے کبھی ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکلا جس سے اُن کی خود بینی، خود پسندی یا بد دماغی یا تعلّی عیاں ہو، اور جہاں کہیں اپنا ذکر کیا ہے ہر ہر جگہ منکسرانہ لہجے میں۔"

یہ خیال غالباً بالکل سچ اور صحیح ہے۔ لیکن لکھنؤ میں تحسین کی مسجد والا واقعہ یعنی جس وقت بادشاہ کی سواری نکلی تھی اگر بالکل غلط ہے تو مصنّف کی رائے سے ذرا بھی اختلاف نہیں۔ اور اگر واقعہ صحیح ہے تو دُنیا ہمیشہ اِسے بد دماغی پر محمول کرے گی۔ اور کر چکی۔

رہی دوستی اور اُس کے مراتب تو وہ بھی تخصیصی طور پر فقط میر صاحب ہی کی ذات تک محدود نہ تھے۔ وہ زمانہ دوسرا تھا اور وہ صدی ہی اور تھی۔ اُس وقت جتنے لوگ پیدا ہوتے تھے اُن سب میں وہ تمام صفات پائے جاتے تھے جو آج ناپید ہیں۔ جتنے لوگ تھے اُسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور میر صاحب ہی تک وہ اوصاف اور قابلیت محدود نہ تھی۔ اُن لوگوں میں عجز و انکسار تھا۔ خود غرضی نہ تھی۔ نخوت و غرور تو اُن سے کوسوں اور منزلوں دور تھا۔

میر صاحب مہذّب تھے۔ مؤدب تھے۔ زندہ دل تھے۔ انصاف پسند تھے۔ ممکن ہے کہ منکسر مزاج بھی ہوں اور چاہے ان اوصاف میں دنیا کی زبان لال ہو۔ لیکن لکھنؤ میں وہاں کے اُمرا و رؤسا جس وقت اُن سے ملنے کے لئے گئے تھے تو میر صاحب کے اُس رویّہ سے کسی طرح انکسار کی جھلک نہیں ظاہر ہوتی جو اُنھوں نے اختیار کی تھی بلکہ اُس طرزِ عمل اور برتاؤ سے تعلّی کی اچھی خاصی بو آج تک پھیلی ہوئی ہے۔

رہیں میر صاحب کی اصلاحیں۔ تو ہمیں جہاں تک یاد ہے گنے گنائے چار چھ اشعار پر میر صاحب نے ضرور اصلاح دی۔ غالباً دو تین شعر میر سجّاد کے۔ ایک شعر ٹیک چند بہار کا۔

اگر اصلاحیں دیکھنا ہے تو عبرت الغافلین کو پڑھئے جس میں مرزا سودا نے مصرع کے مصرع کاٹ ڈالے ہیں۔ اور اگر میر صاحب کی قابلیت اور ہمہ دانی کو کچھ اور زیادہ معلوم کرنا ہے تو میر صاحب کے سلام جو مرزا سودا کے کلیات میں بلا دقّت مل جائیں گے، دیکھئے۔ اس کے سوا خود میر صاحب نے ان کو اپنا ہم پلّہ مانا ہے۔ لکھتے ہیں:-

سارے عالم میں ہوں میں چھایا ہوا مستند ہے میرا فرمایا ہوا

بہ قبولِ خاطر و لطف سخن دے ہے کب سب کو خدائے ذوالمنن

ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز وطور　　اب چنانچہ میر و مرزا کا ہے دور

لکھنؤ میں جب قدر دانی کا سیلاب بڑھ رہا تھا تو میر صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آج کل شاعر کون کون ہے۔ فرمایا ایک سودا دوسرا یہ خاکسار اور پھر کسی قدر تامّل کے بعد کہا۔ آدھے خواجہ میر دردؔ۔ اِسی درمیان میں کسی نے پوچھا اور میر سوز چیں بجبیں ہو کر کہا کہ میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟

انھوں نے کہا کہ آخر وہ بھی نواب آصف الدولہ کے اُستاد ہیں۔ کہا خیر یہ ہے تو پونے تین سہی۔

سودا اور میرؔ کے کلام پر ایک نظر

اب تک جس قدر آپ نے دیکھا اور پڑھا وہ اوروں کے خیالات اور رائیں تھیں۔ ہماری غرض، مدّعا، مقصد، مطلب نہ کبھی موازنہ یا تنقید کی تھی نہ آج ہے۔ اور جو رائے ہماری ہے اُس سے یہ نتیجہ نکالنا ناممکن ہو گا کہ اِن دونوں جلیل القدر شعرا میں سے نہ کسی ایک کے ہم بالکل طرفدار ہیں نہ دوسرے کے مخالف۔ اس لئے ہم نے اپنا روّیہ اور طریقہ ایسا قرار دیا ہے جس میں ذرا بھی ہٹ دھرمی نہ ہو۔

سوداؔ کے مزاج کا عنوان ابتدا ہی سے کچھ ایسا تھا کہ جس پر بلا دقّت یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ ضرورت سے زیادہ اِن میں شوخی، اعتدال سے بڑھ کر ان میں ظرافت، انسانی حدود سے بڑھا ہوا غصّہ جو کسی چولھے پر چڑھی ہوئی دیگ کے جوش کی طرح غیظ سے لبریز تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے وقت کا زیادہ حصّہ ہجو لکھنے میں صرف کیا اور اپنے نام کے ساتھ یہ بدنما دھبّا ایسا لگایا جو نہ آج کسی کے مٹائے مٹ سکتا ہے نہ آئندہ مٹنے والا ہے۔ اس پر طرفہ افسوسناک یہ امر ہے کہ اُن کی ہجوؤں نے زخموں پر فقط نمک پاشی نہ کی ہوگی بلکہ دلوں میں ناسور بھی ڈال دئے ہونگے۔ اِسی کے ساتھ دلچسپی کا ایک بہتر اور عمدہ مشغلہ ہمیشہ کے لئے بطور یادگار چھوڑ گئے جو اُن کی زندہ دلی کا ایک بہتر روزنامچہ ہے۔ اِن میں چند اور بھی خاص صفتیں تھیں۔ مثلاً زبان پر حاکمانہ قدرت، کلام میں زور، مضمون میں نزاکت، خیالات میں جدّت، اور ڈال کے ٹوٹے ہوئے مضامین، اور اِن سب کے ساتھ فصاحت بھی تھی۔

اس لئے آج یہ کہنا سراسر ہٹ دھرمی ہوگی کہ استعارات اور تشبیہات اِن کے یہاں تھے ہی نہیں بلکہ یہ دونوں چیزیں تھیں اور ضرور تھیں مگر اُسی طرح جس طرح پھول میں رنگینی۔ لکھتے ہیں ؎

بھٹکی پھرے ہے کب سے خدایا مری دُعا　　دروازہ تھا قبول کا مامور ہوگیا

غنچے سے مُسکرا کے اسے زار کر چلے　　نرگس کو آنکھ مار کے بیمار کر چلے

اثر ہے آہ میں ہر چند بے تاثیر نالے ہیں　　پر اِتنا ہے کہ اِن دونوں سے میرا جی بہلتا ہے

بھر نظر مجھ کو نہ دیکھا کبھی ڈرتے ڈرتے　　حسرتیں جی کی رہیں جی ہی میں مرتے مرتے

تنہا مرے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش　　رہتا ہے سدا چاک گریبانِ سحر بھی

قاتل ہماری لاش کو تشہیر ہے ضرور　　آئندہ تا نہ کوئی کسی سے وفا کرے

یار وہ شرم سے جو نہ بولا تو کیا ہوا　　نظروں میں سو طرح کے حکایات ہو گئے

سوؔدا کو جُرمِ عشق سے کرتے ہیں آج قتل　　پہچانتا ہے تو یہ گنہگار کون ہے

دشنام تو دینے کی قسم کھائی ہے لیکن　　جب دیکھے ہے مجھ کو تو وہ اک جنبشِ لب ہے

ابتو میں چھوڑنے کا نہیں اُس کو ناصحا ہوئی جو تھی وہ قبلۂ حاجات ہو گئی

اس میں کوئی کلام نہیں کہ سوداؔ کو ایک نوع کی فراغت تھی اور ضرور تھی۔ اور اس کا اثر معاشرت پر پڑنا لازمی اور ضروری تھا اور جس کا عکس اُن کے کلام میں قریب قریب ہر جگہ موجود ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ درد و غم کی زبان اور اُس کا لہجہ ہمیشہ نرم، سادہ اور دھیما نہیں ہوتا اور بقول ہلؔ کے شاعری عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کا نتیجہ ہے مگر جوش اور اُمنگ سے بھرے طبائع کے الفاظ ہمیشہ پُرشکوہ ہوتے ہیں اور قصیدوں کی یہی جان اور زبان ہے۔

میرؔ کا کلام اگر زخمی دلوں پر نمک پاشی کرتا ہے تو سوداؔ کا کلام اہلِ بصیرت کو وجد میں لاتا ہے۔ رنج و الم کا ذائقہ چکھنا ہو نوحۂ غم کا فسانہ اگر سننا ہو تو میرؔ کا کلام دیکھیے۔ نغمۂ طرب و نشاط اور درد و غم کا شوق ہو تو سوداؔ کا کلام دیکھیے۔ کیونکہ دُنیا میں دو ہی پہلو ایسے ہیں جو تخیلات میں معاون و مددگار ہیں یعنی خوشی اور غم۔ ایک اپنی سرگزشت بیان کرتا ہے دوسرا اوروں کے حالات دکھلاتا ہے۔

یہ کہنا تو بالکل غلط ہے کہ میرؔ کا کلام سرتاپا رنج و غم کی داستان ہے اور سوداؔ کا کلام خوشی اور راحت کا شگفتہ گلستان۔ یہ کہنا ایک

فضول بات ہو گی کہ سودا کے یہاں درد و غم کی کہانی موجود نہیں ہے

کیا نیازِ عشق سے غافل ہے نازِ حسن واہ شیریں کیا جانے کہ خوں آلودہ جوئے شیر ہے

دیکھتا ہوں میں تری بزم میں ہر ایک کا مُنہ طلب رحم کی نظروں سے گنہگار کی طرح

آج بیمار کا تیرے ہے ترقی پر ضعف صبح تھا زرد مُنہ اُس کا تو ہوا شام سفید

یہ کون حال ہے احوال دل پہ اے آنکھوں نہ پھوٹ پھوٹ کے اتنا بہو ہوا سو ہوا

ایک شب آ کوئی دلسوز نہ رویا اس پر شمع تک گو رہاری سے جلی دور سدا

غافل ہے اُس مریض سے ظالم کہ جسکے پاس آتا کوئی تو پوچھتا اشک اپنے گھر چلا

تجھ عشق میں روز خوش نہ دیکھا دُکھ بھرتے ہی بھرتے مر گئے ہم

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ سودا کی طبیعت میں شوخی تھی مگر اُن کی یہ شوخی کسی ایک صنف تک محدود نہ تھی۔ وہ کبھی زمین پر کبھی آسمان پر۔ اِس جدّت آفرینی سے جو اُن میں فطرۃً تھی ایک دنیا تیار کرتے

تھے جس میں خیالات وجذبات کے مختلف رنگوں سے گُل بوٹے بنادیتے تھے، جس پر دنیا متوجہ ہوجاتی تھی۔ وہ کہیں خوشی کی نوبت بجاتے اور کہیں صفِ ماتم بچھاتے اور ماتم بھی وہ جس میں جوش وخروش ہو۔

جس کسی کا یہ خیال ہو کہ میر سے قصیدہ نہ ہوسکا یا قصیدہ اُنھوں نے نہیں لکھا سراسر دھوکا ہے۔ میر صاحب اپنے عنوانِ طبیعت کے لحاظ سے بادشاہ اور اُمرا کی مدح سرائی عیب سمجھتے تھے مگر باوجود اس کے اُن کے کُلّیات کے دیکھنے والے اس کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ آج کلیات، آصف الدولہ اور دیگر اشخاص کے قصائد سے خالی نہیں ہے۔ دوسری چیز ہجو جو میر صاحب کے شیوے اور طبیعت کے خلاف چیز تھی، اُس میں بھی میر صاحب نے کوشش کی جس کی بڑی مثال اژدر نامہ موجود ہے۔ اب رہی اِن دونوں صنفوں میں کامیابی یا ناکامی اس کا فیصلہ دنیا کے ہاتھ میں ہے۔ میر صاحب کی دنیا ایک تاریک غمکدہ جس میں عیش وراحت کا کہیں دخل ہی نہ تھا، اُن کی شاعری میں درد کے ساتھ سادگی تھی۔ وہ اپنی سچی داستان بیان کرنے بیٹھتے تھے تو اُس کا کچھ ایسا طرز وطریقہ ہوتا تھا کہ گویا خون کے ٹکڑے کلیجے سے نکال کر رکھ رہے ہیں اور اِسی وجہ سے سُننے والے اور سمجھنے والے فوراً بےچین اور مضطرب ہوجاتے ہیں۔ سمجھنے کی بات ہے جس باغ میں مایوسی اور حسرت کا ابر

آٹھوں پہر گھرا رہتا ہو وہاں کے درختوں کو شاداب دیکھنا حقیقتاً محالات سے شمار کرنا چاہیئے۔ شاعری کا بڑا جزو محاکات ہے جس کو جذبات سے بہت بڑا تعلق ہے کیونکہ اُن میں درد و غم یاس و حسرت سبھی کچھ ہوتا ہے باوجود اس کے کہ میر صاحب سودا کے حریف اور مدمقابل تھے اور اُس وقت کے جس قدر شعرا تھے اُن میں میر صاحب کا درجہ بھی بلند تھا مگر سودا جذبات و کیفیات اور خصوصیت کے ساتھ محاکات کے بادشاہ تھے۔ سودا کہتے ہیں :-

ابر اُسکو بجھاتا ہے وہ بجھتی نہیں سودا　　دی لالۂ خودرو نے یہ کیا کھاد کو آتش

کسے طاقت ہے شرح شوق اس مجلس میں کریگی　　اُٹھا دینے کے ڈر سے سانس وہ لیتے ہیں ڈر ڈر کر

ڈرتے ڈرتے ترے کوچے میں جو آجاتا ہوں　　صید خائف کی طرح رو بہ قضا جاتا ہوں

اسے تو چھپا کہیئے جو یہ قلقل ہے شیشے میں　　مے گلرنگ بھی ساقی عجب بلبل ہے شیشے میں

ہوا ہو یگا کیا فرو ے بہ موج تلطف کا　　خبر کن اپنے حال بد کی اُس دن کاش ہم ہوتے

واہم غلط کار نے دل خوش کیا　کس پہ نہ جانے وہ نظر کر دیا

گُل ہے عاشق ترا قسم مت کھا　یوں گریباں کسی کا پھٹتا ہے

ہستی سے اس نگاہ کی لے محتسب خبر　دُنیا تمام بزمِ خرابات ہو گئی

سخنِ عشق نہ گوشِ دلِ بیتاب میں ڈال　مت یہ آتش کدہ قطرہ سیماب میں ڈال

اشارے کے بلانے سے ہوا رسوا ہی یوں سودا　قیامت اُس پہ آئیگی جو تیرے قول پر ٹھیرا

جوں شمع تن ہوا شبِ ہجراں میں صرفِ اشک　پھر جس قدر میں چاہیے تھا اُتنا نہ رُو سکا

جمع ہیں ابرِ بہار سے اب شراب ٹپکے تو کیا عجب ہے　ہوا ہے رونا قبولِ ساقی جنابِ عالی میں مسکینوں کا

ناتوانی بھی عجب کچھ ہے کہ گلشن میں نسیم　نت لئے پھرتی ہے دوش اوپر بر رنگِ برگِ گل

اثر بے آہ ہے ہر چند بے تاثیر نالے ہیں　پر اتنا ہے کہ ان دونوں سے میرا دل بہلتا ہے

رخصت ہے اپنے تئیں ورنہ عندلیب　　تاثیرِ صد ترانہ اک آہِ سحر میں ہے

مندرجہ بالا اشعار میں جو باریکیاں اور نزاکتیں ہیں وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ جس میں زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔

میرؔ کے کلام میں بھی کچھ نہ کچھ خوشی کی جھلک کبھی نہ کبھی نظر آجاتی ہے اس لئے یہ کہنا کہ میرؔ کا کلام سراسر سوز و گداز سے لبریز ہے اور سوداؔ کا ہر شعر خوشی و مسرّت کا نغمہ۔ نہیں کہا جا سکتا۔

رہا کرنا ہمیں صیّاد اب پامال کرنا ہے　　پھڑکنا بھی جسے بھولا ہو وہ پرواز کیا سمجھے

قاصدِ اشک آ کے خبر کر گیا　　قتل کوئی دل کا نگر کر گیا

ضعف سے نالہ بھی اب دل سے نہیں　　درد لاتا ہے بہت خون جگر سے باہر

یوں دیکھتا ہوں اُس ستم ایجاد کی طرف　　جوں صید وقت ذبح کے صیّاد کی طرف

بال و پر توڑ کے سونپے ہے قفس کو صیّاد　　تجھ سے رخصت ہے مری اے ہوسِ آزادی

مَیں اُسکو شرحِ سوزِ دل لکھوں کس طرح کہہ بھیجوں　　زبانِ شمع تک کٹتی ہے واں اب ہو کے پیغامی

دل دینے پہ جو چاہو تعزیر کرو ہم کو   اس امر میں اپنی ہی تقصیر نظر آئی

آخدا کے واسطے سودا کو ہر دم مت ستا   عاشقِ رنجور ہے مجبور ہے مہجور ہے

کہیو صیّاد سلام ہمارا بہار سے   ہم تو چمن کو چھوڑ کے سوئے قفس چلے

ہوا کس پر یہ دیوانہ الٰہی   کہ موجِ اشک ہے زنجیر دل کی

مجھ چشم سے اب اشک نہیں آنے کا ناصح   آوے بھی غم دل سے تو لختِ جگر آوے

مجرم ہوں میں تو کہہ دو مکافات کے لئے   مُنہ میں خدا نے دی ہے زباں بات کے لئے

طاقت کہاں ہے اب جو گنوں وعدے کے میں دِن   اسوقت بھی ملو تو دموں کا شمار ہے

کر ذبح اسکو خواہ رہا کر کہ مرغِ دل   پر بستہ تیرے تارِ نگہ سے شکار ہے

سودائے دل کو زلفِ گرہ گیر شرط ہے   دیوانے کے علاج کو تدبیر شرط ہے

عام طور پر ایسے جذبات جن کا بہت کچھ تعلق اُمید و خوشی سے ہوا کرتا ہے شاعر کی جودتِ طبع اُسے نظم کا جامہ پہنا دیتی ہے۔ میر صاحب کے یہاں خوشی اور اُمید کی پیدائش کا فور تھی۔ اِسی وجہ سے اُن کی عام شاعری میں ایسے جذبات کا پرتو وہمی اور خیالی تھا۔ عزلت نشینی، افسردہ دلی، اور سب سے بڑھ کر خودی تھی جو جذبات کو غور و فکر کا موقع نہ دیتی تھی اور تمام مایوسانہ اور دردمندانہ خیالات کا ایر پھیر پڑا رہتا تھا اور جس قدر تصویریں اُترتی تھیں وہ مایوسانہ اور دردمندانہ ہوتی تھیں۔ یہ ایک موٹی سی بات سمجھنے کی ہے کہ جس کسی کے دروازے پر باغ لگا ہوا ور برسوں اُس باغ میں اُس کا گزر نہ ہوتا ہو وہ خزاں اور بہار کی تصویر بھلا کیا خاک کھینچ سکے گا۔ اِسی وجہ سے جتنی تصویریں کھچیں اُن میں کچھ بھدی اور کچھ پھیکی جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ خود کچھ مجبور تھے۔ اِس مجبوری کا نام کسی نے کمزوری جانا اور کسی نے معذوری مانا۔

بہرصورت جب محاکات کی جان تخییل مان لی گئی تو مشاہدات میں ترتیب اور توافق پیدا کر نا رنگ و روپ کو بڑھانا تخیل کا کام ہے۔ ورنہ خالی محاکات ایک نوع کی حقیقی اور صحیح نقالی ہے۔ محاکات کے لئے چونکہ تخیل ضروری ہے اور تخیل میں محاکات لازمی۔ آج شاعری کی روحِ رواں دونوں چیزیں تخیل اور محاکات ہیں۔ رہے استعارے

اور تشبیہات یہ اُس کے خط و خال ہیں جن کے نہ ہونے سے جمالِ انشا پردازی بالکل بدرنگ و بے روپ رہتا ہے اور وہ زور اور وہ وسعت کلام میں پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جس وقت شاعر کو بہت نازک اور نہایت لطیف شے یا کسی انتہائی حالت کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو عبارت آرائی نہ کچھ کام کرتی ہے نہ الفاظ اپنا صحیح مفہوم ادا کرتے ہیں اور صاف طریقے سے کھل جاتا ہے کہ اس موقع پر الفاظ محض بیکار ہیں اور صورت میں تشبیہات سے کام لینا شاعر پر لازم ہو جاتا ہے اور مجبوراً نہ اس موقع کے لئے اُسے بہت لطیف اور نازک صورت قائم کرنا پڑتی ہے۔

تشبیہات میں جبتک کوئی خاص نُدرت اور خوبی نہیں ہوتی کلام میں کوئی خاص اثر نہیں پیدا کر سکتی۔ سودا کے ذیل کے اشعار میں چند خاص خصوصیتیں ہیں جو نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔

رہتا ہے اِن دلوں دہنِ یار کا خیال　　بھاتا ہے ناصحا سخنِ مختصر سب مجھے

ہو دستِ نعدائی میں تو کیجے یہ منادی　　ظالم ہو جو کوئی وہ طرفدار نہ ہووے

بوئے گُل بادِ صبا کوچے کو کس کے یارب　　دوڑے ہیں دونوں ہم باندھ کے دامن دامن

اس واسطے کہ ہیں یہ وحشی نکل نہ جائیں — آنکھوں سے تیری مژگاں ڈوروں کی کشتیاں ہیں

سبقِ ناز پڑھا کس نے چمن ہیں جا کر — جنبشِ لب نے لٹائے ورقِ گل خوں میں

آگے بڑھ کر ایک موقع پر حکمت و فلسفہ کے مسائل پر نظر ڈالی ہے، دیکھئے فرماتے ہیں ؎

یوں باز اخذِ نور سے ہم کو رکھے ہیں جسم — جیسے خسوفِ ماہ کے حائل زمین ہے

اب آخر میں ایک انتخاب سودا کا ہم لکھتے ہیں۔

میں کس کس شعلہ خو کو سینۂ صد چاک دکھلا دوں
جو دل تھا ایک سو تو جل بجھا کیا خاک دکھلا دوں
چل اُٹھ سائے سے دیوارِ حرم تک شیخ آ مجھ تک
تجھے نیرنگیِ قدرت یہ زیرِ تاک دکھلا دوں

ذیل کی غزل میں بندش کے علاوہ تشبیہات کی نزاکت، استعارات کی لطافت نے قدرتی مناظر سے رل جل کر ایک عجیب عالم پیدا کر دیا ہے ؎

لطف و نشاط بادۂ حسن و ظہورِ صبح — مل کر ہوا ہے خلق دو جانِ سرورِ صبح
لہرائی ہے نسیم کہ کیا ہے یہ ساقیا — گویا ہے فوج بادۂ جامِ بلورِ صبح
گزرے ہے چشمِ تر سے مری یوں وہ سیمتن — جیسے کنارِ بحر سے ہووے عبورِ صبح
حلقے ہیں اس کی زلف کے عارض پہ کر نظر — جوں شب میں رہ گیا ہو گرہ کھا کے نورِ صبح
آویزۂ گہر ہے بنا گوشِ یار میں — یا سرنگوں ہے اس کے مقابل غرورِ صبح

سودا کہوں میں یار سے کیا جس کے سامنے
اُڑ جائیں ہیں حواس برنگِ ظہورِ صبح

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ میر صاحب کے کلام میں ایسے نادر خیالات، اعلیٰ استعارات، لطیف نادر تشبیہیں ملنا دشوار ہیں، مگر سچ یہ ہے کہ شاعر کے لئے کسی مضمون کو نئی جدّت سے ادا کر جانا اور ہر سیدھی سی بات کو جدید انداز اور نئے اسلوب سے بیان کر جانا ہی جوہر شاعری ہے۔

چہ بے گنہ چہ گنہگار یہ نہ ہو وہ ہو
وہ شوخ قتل کو تیار یہ نہ ہو وہ ہو

مرے نامے کی خاطر مُرغِ دل سے کون بہتر ہو
تجھے نامہ لکھوں اور نامہ بر میرا کبوتر ہو

خط اپنے مُرغِ جاں کے پر سے باندھا آج سودا نے
نہ کھینچا انتظار اتنا کہ تا پیدا کبوتر ہو

غنچوں کو گو شگفتہ چمن میں صبا کیا
لیکن ہمارے غنچۂ دل کو نہ وا کیا

نہ سرمہ چشم میں اے شوخ خانہ جنگ لگا
چلے گی خاک جو تیغِ نگہ میں زنگ لگا

دل کو اے عشق سوئے زلفِ سیہ فام نہ بھیج
رہزنی میں تو سرِ شام مسافر کو نہ بھیج

میکشاں روح ہماری بھی کبھی شاد کرو ٹوٹے گر بزم میں شیشہ تو ہمیں یاد کرو

کہوں کیا عشق کی آتش سے یار دمجھ پہ جو گزری سُنی جو شمع نے بھی سرگزشت اپنی تو رو گزری

وصل بھی ہو تو دل مراغم کو نہ چھوڑے ہجر کے یہ تو ہے ہمیشہ ہے رفیق وصل ہے گاہ گاہ کا

سوداؔ کی مختلف خصوصیات پر خیال کرتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ وہ اپنے کلام میں نشستِ الفاظ کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔

سوداؔ

آنکھیں برنگِ نقشِ قدم ہوگئیں سفید اس سے زیادہ خاک کروں انتظار خط

میرؔ

آنکھیں برنگِ نقشِ قدم ہوگئیں سفید نامے کے انتظار میں قاصد چلا پھرا

سوداؔ کے شعر کی بندش اور میرؔ کے شعر کی ترتیب اگرچہ جُدا جُدا ہے مگر انصاف بیں نگاہیں اور نکتہ چیں نظریں اندازہ کرسکتی ہیں کہ ایک کے شعر میں کیا لطافت اور فصاحت ہے اور دوسرے کے شعر میں کیا بلاغت و لطافت ہے۔ ایک کے یہاں جوش وخروش ہے، دوسرے کے یہاں حُزن و ملال ہے اور اس طرح دونوں کا پلّہ برابر رہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ سوداؔ کے شعر کے دوسرے مصرع میں اتفاق سے ایک محاورہ

بندھ گیا۔

میر

گل اُس کی سی جو بو آئی تو آیا نہ گیا ہم کو بنِ دوشِ ہوا باغ میں لایا نہ گیا

سودا

ناتوانی بھی عجب کچھ ہے کہ گلشن میں صبا نت لیے پھرتی ہے دوش اوپر برنگِ بو مجھے

ظاہر ادوشِ ہوا پر واپس آنا شعر ظاہر نہیں کرتا پس کمزوری یا ناتوانی کا لفظ جب تک اضافہ نہ کیا جائے مطلب مغلق ہو کر رہ جاتا ہے۔

میر

چمن میں گُل نے جو کل دعویِ جمال کیا جمالِ یار نے مُنہ اُس کا خوب لال کیا

سودا

برابری کا ترے گُل نے جب خیال کیا صبا نے مار تھپیڑے مُنہ اُس کا لال کیا

میر

حرف نہیں جاں بخشی میں اُسکی خوبی اپنی قسمت کی ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا

سودا

کون سا مجھ سے حُسنِ تردّد عمل میں آیا تیرے حضور دل کو غارت کرے میری جان کو کیوں پیغام کیا

میر

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سودا

اجل تیرے عہد میں ہے تقدیر کا یہ پیغام کیا   ناز و تغافل دیکر اُس کو مجھ کو کیوں بدنام کیا

میر

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہووے ہی   کوسوں اُسکے دور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

سودا

ادب دیا ہے ہاتھ سے اپنے بھلا کبھی میخانے کا   کیسے ہی ہم مست چلے ہر سجدہ ہر ہر گام کیا

میر

کاش اب مُنہ سے برقع اُٹھاوے ورنہ پھر کیا جائے ہی   آنکھ مُندے پر اُن نے تو دیدار کو اپنے عام کیا

سودا

خاص کروں میں ہی نظارہ تو تو دید کی لذت ہے   کور بھلیں یہ آنکھیں اُسدن جبدن جلوہ عام کیا

میر

گلہ میں جس سے کروں تیری بیوفائی کا   جہاں میں نام نہ لے پھر وہ آشنائی کا

سودا

گلہ لکھوں میں اگر تیری بیوفائی کا   لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا

میر

ایک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے   ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

سوداؔ

سوداؔ جہاں میں آکے کوئی کچھ نہ لے گیا — جاتا ہوں ایک میں دلِ پُر آرزو لئے

میرؔ

کفر کچھ چاہیئے اسلام کی رونق کے لئے — حُسنِ زنّار سے تسبیح سلیمانی ہے

سوداؔ

ہوا جب کفر ثابت پھر ہے دعوائے مسلمانی — نہ ٹوٹی شیخ سے زنّار و تسبیحِ سلیمانی

ذیل کے چند اشعار جو سوداؔ کے نقل کئے جاتے ہیں اُن کے قافیے اور ردیف غیر معمولی ہیں ؎

سینے میں ہوا نالہ و پہلو میں دل آتش — دھڑکے ہے پڑا دل کہ نہ ہو مشتعل آتش

اشک آتش و خوں آتش و ہر لختِ دل آتش — آتش پہ برستی ہے پڑی متّصل آتش

دل عشق کے شعلے سے جو بھڑکا تو رہا کیا — اے جان نکل جا کہ لگی متّصل آتش

یاقوت نہیں ہے وہ ترے لعل سے اے شوخ — جا ڈوب ہوئی آگ میں ہو کر خجل آتش

داغ آج سے رکھتا نہیں اِن سنگدلوں کا — مدّت سے ہوئی ہے مری چھاتی پہ سل آتش

معنی آفرینی ملاحظہ کیجیے ؎

پایا ہر ایک بات میں اپنی نہ یوں تجھے — معنی کو جس طرح سخنِ عاشقانہ میں

ہم سا تجھے تو ایک ہمیں تجھ سا ہیں کئی — جا دیکھ لے تو آپ کو آئینہ خانے میں

قسمی کو یہ طاقت ہے کہ اس سے بسر آئے
وہ زلف سیہ اپنی اگر لہر پہ آئے

مجھ چشم سے اب اشک نہیں آنے کا ناصح
آوے بھی غم دل سے تو لختِ جگر آئے

کیا ہو جو قفس تک مرے اب صحنِ چمن سے
دو برگ لئے گُل کے نسیمِ سحر آئے

سب سے کہے دیتا ہوں یہ کہدیں کہ پھر آنا
بالیں پہ مری شورِ قیامت اگر آئے

خوبوں میں دل دہی کی روش کم بہت ہی یاں
خواہاں چاہو تو عالم بہت ہے یاں

چشمِ ہوس اُٹھا لے تماشا ہے جوں حباب
نادیدنی کا دید بس اک دم بہت ہی یاں

دیکھا جو باغِ دہر تو مانندِ صبحِ گل
کم فرصتی ملاپ کی باہم بہت ہے یاں

ہم نے کتاب بھر میں کسی جگہ اپنی رائے اور خیال کے موافق مقابلے سے بحث اور غرض نہیں رکھی۔ یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ ہماری نظر کے سامنے بعض ایسے مضامین آ گئے جن پر میرؔ اور مرزاؔ دونوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ اور بخیال دلچسپی اُسے درج کرنا پڑا۔ مثلاً فراق کے مضمون کو دونوں نے لکھا ہے۔

فراق

میرؔ

گزرے ہے شب خیال میں خوباں کے جاگتے
آنکھیں لگا کے اُن سے میں ترسوں ہوں خواب کو

کہنے سے میرؔ اور بھی ہوتا ہے مضطرب
سمجھاؤں کب تک اس دلِ خانہ خراب کو

بے طاقتی میں شب کے پوچھو نہ ضبط میرا
ہاتھوں میں دل کو رکھا دانتوں تلے جگر کو

سودا

تجھ بن عجب معاش ہے سودا کی ان دنوں
تو بھی نو اُس کو جا کے ستمگار دیکھنا

نے حرف نے حکایت نے شعر و نے سخن
نے سبز باغ بے گُل و گلزار دیکھنا

خاموش اپنے کلبۂ احزاں میں روز و شب
تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا

یاروں کا گلہ

میر

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں تیرا ہو گزر
کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حالِ زار

ربط کا دعویٰ تھا جن کو کہتے تھے مخلص ہیں ہم
جانتے ہیں ذاتِ ساقی ہی کو ہم سب خاکسار

سو نہ خط اُن کا نہ کوئی پرچہ پہنچا مجھ تلک
واہ وا ہے ربط رحمت ہے یہ اخلاص و پیار

سودا

وہی ہیں دن وہی راتیں وہی سحر وہی شام
وہی ہے روشنی مہر و مہ جو کچھ تھی مدام

نہ جانوں دورِ محبت کا کیا ہوا یا رب
کہ دوستوں سے جدا کر کے گردشِ ایام

ہمیں لے آئی ہے شہرِ غریب جس دن سے
کبھو انھوں کی طرف سے نہ نامہ ہی نہ پیام

جو وہ پھرے ہیں اُدھر سے تو یہ بھی کہتا نہیں
کہ ہیں کہیں تھی تری بندگی انھوں کو سلام

عبرت

میر

اے حُبِّ جاہ والو جو آج تاجور ہے
کل اُس کو دیکھنا تم نے تاج ہے نہ سر ہے

اے ہم صفیرِ گُل کس کو دماغِ نالہ
مدّت ہوئی ہماری منقار زیرِ پر ہے

شمعِ اخیرِ شب ہوں سُن سرگزشت میری
پھر صبح ہوتے تک تو قصہ ہی مختصر ہے

اب رحم پر اُسی کے موقوف ہے یہاں تو   نے اشک میں سرایت نے آہ میں اثر ہے

سوداؔ

نہ کر غرور تو زنہار اس پہ اے ناداں   جو مرتبہ ہے ترا شکلِ مہر و ماہ بلند
کرے ہے گردشِ دوراں طرح ہنڈولے کے   ہر ایک شخص کو یاں گاہ پست گاہ بلند

ٹک ہمرہانِ قافلہ سے کہدے اے صبا   ایسے ہی گر قدم ہیں تمھارے تو ہم رہے
سوداؔ ہے طِلسم زمانے کا اعتبار   نے جام ہی رہے ہیں جہاں میں نہ جم رہے

میرؔ صاحب نے مرزا کی طرح قصیدے میں بھی زورِ طبع دکھایا ہے۔ دیکھیے!

سوداؔ

بخشتے ہے گُلِ نورستہ کی رنگ آمیزی   پوششِ چھینٹِ قلمکار سرِ دشت و جبل

میرؔ

جوشِ گُل یہ ہے جہاں تک کرے کام نگہ   لالۂ زرکش گل سے ہیں بھرے دشت و جبل

سوداؔ

واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ   آبجو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

میرؔ

لطفِ روئیدگی مت پوچھ کہ میں شبہے میں ہوں   سبزہ غلطاں ہے لب جو پہ کہ خوابِ مخمل

سَودا

جوشِ روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں　　شاخ میں گاؤزبان کے بھی جو پھوٹے کوپل

میرؔ

سیر کر تازگی و خرّمی و شادابی　　خشک بھی شاخ نے اب سبز نکالی کوپل

سَودا

تاکجا شرح کروں میں کہ بقولِ شاعر　　اخگر از فیضِ ہوا تیز شود در منقل

میرؔ

برگِ گل فیض ہوا کرتا ہے ہر اخگر کو　　آگ گر کہیں سُلگا کے رکھے ہیں منقل

ہم نے میرؔ اور سَودا کے قصائد سے چند اشعار کا انتخاب بھی درج کر دیا جس سے دونوں کے مضامین کا رنگ بھی صاف اور نمایاں ہو جاتا ہے۔

سَودا کے قصائد

مرزا سودا کے حالات پر جس قدر تالیفات اب تک نظر سے گزریں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا کے قصائد کی جانب کسی ایک نے بھی نظر نہیں ڈالی۔ جس کی ظاہرا وجہ سوا اِس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ انصاف بیں نگاہوں نے اپنی آنکھ سے عینک بھی اُتار ڈالی تھی اور

لاپروائی کا جامہ پہن لیا تھا۔ اور اس طرح ایک بڑا جز جو مرزا کی خصوصیات کا قابل ستائش عنصر تھا اُسے پامال کر دیا۔ یہ کہنا کہ اُن کے قصائد کے ادق مضامین عام فہم نہیں ہیں اس لئے اُنھیں پڑھنا ہی گناہِ عظیم ہے، انوکھی بات ہے۔ اس لئے جن لوگوں کی یہ رائے ہے اور جنھیں مرزا کے زورِ قلم کا اندازہ نہیں ہے وہ اگر غور کرینگے تو اُنھیں ظاہر ہو جائیگا کہ مرزا کی غزلیں اور اُن کے مضامین بھی نومشقوں اور معمولی اردو خوانوں کے لئے کب ادق نہیں ہیں۔ مگر وہ اپنی نافہمی کا اعتراف تو کرنا نہیں چاہتے اور تہمت دھر اُستادوں پر یقیناً عائل ہیں۔

مرزا سودا نے اس صنف میں جو ناموری و شہرت حاصل کی اُس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ ایرانی شعرا جو فصاحت کے مسلم الثبوت اُستاد تھے۔ اُنھیں شعرا کے معرکتہ الآرا قصائد پر قصائد لکھ کر متانت، شان و شوکت اور مضمون آفرینی کے ساتھ زورِ طبع دکھلایا ہے اور خاقانی کے اُس مشہور قصیدے پر قصیدہ لکھا ہے۔

"کہ ہمت را زنا شوئست باز آلودہ پیشانی"

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی	نہ ٹوٹی شیخ سے تسبیح زنارِ سلیمانی
ہُنر پیدا کر اوّل ترک کیجو تب لباس اپنا	نہ ہو جو تیغ بے جوہر و گرنہ ننگِ عریانی
فراہم زر کا کرنا باعثِ اندوہِ دل ہوئے	نہیں کچھ جمع سے غنچے کو حاصل جز پریشانی

خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہلِ دولت کی ۔۔۔ نہ جھاڑی آستینِ کہکشاں شاہوں کی پیشانی
عروجِ دستِ ہمّت کو نہیں ہے قدر بیش و کم ۔۔۔ سدا خورشید کی جگ پر مساوی ہے زرافشانی

قصیدۂ ثانی

عجب ناداں ہیں جن کو ہے عجب تاجِ سلطانی ۔۔۔ فلک بام ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی
نہیں معلوم اُن نے خاک میں کیا کیا ملا دیکھا ۔۔۔ کہ چشم نقش پا سے تا عدم نکلی نہ حیرانی
زمانے میں نہیں کھلتا ہے کارِ بستہ حیراں ہوں ۔۔۔ گرہ غنچے کی کھولے ہے صبا کیونکر بآسانی
جنوں کے ہاتھ سے سر تا قدم کاہیدہ رہتا ہوں ۔۔۔ کہ اعضا دیدۂ زنجیر کی کرتے ہیں مژگانی
سیہ بختی میں اے سوؔدا نہیں طولِ عمل لازم ۔۔۔ نمط خامے کی سر کٹوائیگی ایسی زباندانی

ذیل کا قصیدہ قابل خیال و توجہ ہے۔ ضرورت تو تھی کہ یہ پورا درج کر دیا جاتا کیونکہ بعض مخالفین نے اس قصیدے کو بہمہ وجوہ و بہمہ صفت مکمل تسلیم کیا ہے۔

کیا قلم کو رقم سے ہے منظور ۔۔۔ کہ صریر اُس کی سے ہے دل مسرور
نورِ صبح بہار کاغذ پر ۔۔۔ خط خطِ گلعذار کا دستور
ہے تبسّم قلم کے مُنہ پر شق ۔۔۔ قلم اپنی رقم سے ہے مسرور
ہے تواں بخش ناتواں کا وہ ۔۔۔ شاہد اس کا ہے متفق جمہور
شُعلہ پیرا ہو جس دم اُس کی تیغ ۔۔۔ ہوئے خاکِ سیہ عدم میں فتور

اُس کی بُرِش کا وصف کیا میں کروں — سخت اور نرم پر بایں دستور
سخت پر جیسے تار صابن سے — نرم پر جوں ہوا میں بالِ طیور
ہے فرس کس کے زیرِ ران ایسا — جس کے جلوے کا ہووے یہ مذکور
گردِ پل میں تمام روئے زمیں — سینۂ باز نقشِ لعل ستور
خس و آتش ہو جس جگہ واں سے — راہِ چپ کردہ جائے بادِ سحور
کہکشاں خامہ آسماں کاغذ — ہو مرکّب اگر شبِ دیجور

اِتنے ساماں پہ تیرے سب اوصاف
آویں تحریر میں یہ کیا مقدور

عرفی کے قصیدے پر جو قصیدہ لکھا ہے اُس میں گریز کے موقع اور محل پر پورا مصرع اپنا ہی کر لیا ہے۔

تا کجا شرح کروں میں کہ بقولِ عرفی — اخگر از فیضِ ہوا تیز شود در منقل

اِس قصیدے کی بلاغت اور فصاحت نے مجبور کیا کہ بارہ شعر اور لکھے جائیں۔

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل — تیغ اُردے نے کیا ملکِ خزاں مستاصل
سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک — دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عزّ و جل
قوتِ نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض — ڈال سے پات تلک پھول سے لیکر تا پھل
واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ — آبجو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

بخششِ ہے گُل نورستہ کو رنگ آمیزی — پوششِ چھینٹ قلمکار بہر دشت و جبل
شاخ میں گُل کی نزاکت یہ بہم پہنچی ہے — شمع ساں گرمیِ نظارہ سے جاتی ہے پگھل
حدِ ایام کی پیش از مددِ نامیہ سے — بچۂ مُرغِ چمن تخم سے آتا ہے نکل
چشمِ نرگس کی بصارت کے زبس ہے درپے — غنچۂ لالہ نے سرمے سے بھری ہے مکحل
آبجو گردِ چمن لمعۂ خورشید سے ہے — خطِ گلزار کے صفحے پہ طلائی جدول
اس قدر محوِ تماشا ہے کہ نرگس کی طرح — چشمِ سیارِ گلستاں کی جھپکتی نہیں پل
جوہری کو چمنستانِ جہاں میں اس فصل — آگیا لعل و زمرد کے پرکھنے میں خلل

سوداؔ نے اکثر قصائد ایسے لکھے ہیں جو نعت اور منقبت میں ہیں اور اُس کی ردیفیں غیر معمولی ہیں۔ اُسی کے ساتھ دلاویزی کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور بہت خوبی کے ساتھ نباہا ہے۔

چہرۂ مہر وش سے ایک سنبلِ مشک فام دو
حُسنِ بیاں کے دور میں ہے سحر ایک شام دو
میرے ترے یہ رابطہ ہے جیسے میانِ بحر و موج
واقعی میں تو ایک ہیں گو کہ ہوئے ہیں نام دو
ابروئے یار کا خیال دل میں رہے ہے روز و شب
ہوئے جو تیغ آبدار کیوں نہ کرے نیام دو
فکرِ معاد اب کریں یا کہ معاش کی تلاش

زندگی تو اپنی ایک دم کیجئے کیونکہ کام دو

خرد و بزرگ دہر میں نسبت جام و شیشہ جاں

بادہ تو اُن میں ایک ہے گو کہ ہوئے پیام دو

آج کون واقف نہیں کہ بہاریہ قصائد کی تمہید عام چیز ہے مگر سودا نے ہر قصیدے کو ایک نئے انداز اور عنوان سے اُٹھایا ہے اور پورا کیا ہے قصائد میں گریز کی صفت ایک ایسی صفت ہے جس میں سودا کو خاص درک تھا۔ خدا کی دین ہے جس کو خدا دے۔

فجر ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک ۔۔۔ دی وہیں آکے خوشی نے در دل پہ دستک

پوچھا میں کون ہے بولی کہ وہ میں ہوں غافل ۔۔۔ نہ لگے شوق میں جس کے کبھو شائق کی پلک

ہے خوشی نام مرا میں ہوں عزیز دلہا ۔۔۔ زندگانی کی حلاوت ہے جہاں میں مجھ تک

سُن کے یہ مژدۂ جاں بخش جو میں کھولی آنکھ ۔۔۔ اشعۂ نور کی سی مجھ کو نظر آئی جھلک

آنکھ مل کر کے جو دیکھوں ہوں تو اک بادلہ پوش ۔۔۔ سر سے لے غرق جواہر میں ہے وہ پاؤں تلک

چہرے میں ایسی ہے گرمی کہ شب و روز جیسے ۔۔۔ یاد کرتی رہی ہے دامن مژگاں کی جھپک

زلفیں یوں چہرے پہ بکھری ہوئی مانگے تھی دل ۔۔۔ جس طرح ایک کھلونے پہ منٹیں دو بالک

ناگنی بیچ میں آ اُن کے نہ مانگے پانی ۔۔۔ کھیل جائے وہیں کالا جو ڈسے اُس کی لٹک

فتنہ اُس چشم کا ایسا کہ مژہ سے خونخوار ۔۔۔ متصل جو نکتے پاکر دیا کرتے ہیں ٹھپک

بحر خوبی کی گویا مچھلی ہے قلاب کے بیچ ۔۔۔ مُنہ کے حلقے میں جو دیکھے کوئی نتھنی کی پھڑک

دونوں عارض گویا شیشے ہیں مے گلگوں کے ‏ زنخ اُن دونوں میں یوں جیسے نمکداں میں نمک

مطلع دوم

رنگِ رخسار سے شرمندہ ہو کُندن کی دمک
آگے غبغب کے خجالت زدہ سونے کی ڈلک

دیکھے جو اُس کی کچوں کو متیقّن ہو اُسے
تنبویہ تان کے یاں کام کو اُترا ہے کنک

یا وہ معجونِ مبہّی کی ہیں ڈبیاں ایسی
آوے ہیجان میں جھیڑے سے جنھیں روحِ مَلک

نرگسی چشم کوئی ہوگا کہ جس کی یہ آنکھ
لگ کے چھاتی سے صفا کے سبب آئی ہے ڈھلک

قدم اس دھج سے رکھے ہے کہ سرِ عالم کو
موجبِ شور ہو خلخال کے بادل میں جھنک

تجھ سے ممنوں نہ فقط روئے زمیں پر ہر ایک
بارِ احساں سے تیرے ہے دوتا پشتِ فلک

آگے تجھ بحرِ کرم کے صدفِ پُر گوہر
ہیٹی اُس کی ہے جیسے نکلے بشدّت پیچک

دستِ دوراں ہے موالید کا سر رشتۂ کار
نعرۂ قہر کی ہیبت سے ترے جائے ٹھٹک

وہ جواں تو ہے کہ آگے سے ترے رستم بھی
گاؤ سر بار بغل جائے دبے پاؤں کھسک
اُس کے مرکب سے ملا کر وہیں مرکب اپنا
ہاتھ پٹکے میں دے اور زین کے خانے سے اُچک

مطلع

اُس کے کج کاہ کی اللہ ری چہرے پہ لٹک
کہکشاں جوں شب یلدا میں نمایاں بہ فلک
لیلیٰ نے ہاتھ نکالے ہیں سیہ خیمے سے
ملنے کی مجنوں سے سُن سلسلۂ پا کی جھنک
بے نکان اس قدر اُس کا ہے چلاوا جیسے
مہر میں ابر کے آنے سے ہو سلئے کی ڈھلک
اس قدر رہے وہ سُبک رو کہ کبھو چلتے وقت
پاؤں کی اُس کے دلِ مور کو پہنچے نہ دھمک
جبہہ سائی ہے پر کھیاں زر انساں کے لئے
آستاں کا ہے ترے سنگ بہ از سنگ محک

ذیل کے چاروں قصیدوں کے اشعار کو اگر شمار کیا جائے تو اُن کی تعداد ایک ہزار سے بہت زائد ہوتی ہے اور ہم نے صرف پچیس۲۵ شعر لکھے ہیں۔

یار و مہتاب گُل و شمع بہم چاروں ایک
ہیں کتاں بلبل و پروانہ بہم چاروں ایک
کردیا پل میں کرشمے نے تری آنکھوں کے
مسجد و میکدہ و دیر و حرم چاروں ایک
وہم و اندیشہ خیال اور وہ معشوق نژاد
رکھتے ہیں قطعِ مسافت میں بہ دم چاروں ایک
انوَری سعَدی و خاقانی و مدّاح ترا
رتبۂ شعر و سخن میں ہیں بہم چاروں ایک
بادِ تند و شرر و برق و خس و خارا اے یار
جو تری خلق ہوئی ہو کے بہم چاروں ایک

سنگ رنگ ڈھنگ کی زمین میں جو قصیدہ لکھا ہے اُس میں بھی چالیس اکتالیس شعر سے زائد ہیں۔

میں نے دُرِ سخن کو دیا سنگ رنگ ڈھنگ
تھا ورنہ اس رقم میں کب اس رنگ رنگ ڈھنگ
بُلبُل کے زمزمے کا چمن بیچ کیا محال
پیدا کرے کلاغِ بدآہنگ رنگ ڈھنگ
آئینۂ سخن پہ معانی کی شکل کا

رکھے ہیں جن کے لفظ بہ رنگ رنگ ڈھنگ

مجھ کو نہنگِ بحرِ معانی سے کام ہے

سمجھے سخن کو کیا کوئی خر چنگ رنگ ڈھنگ

کر اس غزل کو غور کہ تیری جناب میں

داد اس کی چاہتا ہے بہ ہر رنگ رنگ ڈھنگ

انتخاب میں بخیالِ طوالت زائد شعر نہیں درج کئے ہیں۔

کھُلے جو کام سے میرے پڑے ہزار گرہ — بسانِ دانۂ روئیدہ ایک بار گرہ

رکھے ہے کیوں مری خاطر کو روزگار گرہ — نہ لٹ دھوئیں کی ہے یارب نہ زلفِ محبوباں

کہ بند یار میں دے جائے جیسے یار گرہ — گیا ہے چھوڑ کے یوں دل میں عقدہ غم میرا

گلے سے پڑتی ہے دل تک ہزار بار گرہ — برنگِ شیشۂ مئے وقتِ اشک ریزی کے

کھُلاوے کس کنے جا کر وہ خاکسار گرہ — بس اب بتا کہ اس اُلجھیڑے کی سوا تیرے

دُنیا کا کوئی فرد ایسا نہیں ہے جو اپنی جگہ پر اور اپنے بے تکلّف احباب کی صحبت میں بیٹھ کر تعلّی سے باز رہے۔ سوؔدا نے اگر اس قصیدے پر داد چاہی تو کوئی بیجا امر نہیں ہے۔ میرؔ صاحب نے مختلف جگہوں پر تعلّی کی لی ہے چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

مرے آگو نہ شاعر نام پاویں

قیامت کو مگر عرصے میں آویں

پھر شجاع الدولہ کی شان میں جو قصیدہ لکھا ہے اُس میں بھی رنگ ڈھنگ زمین ہے۔ قصیدہ تو بڑا تھا ہم نے بہت اختصار کے ساتھ چند شعر درج کیے ہیں۔

اشجار کا بستانِ جہاں میں ہے عجب رنگ
جلتا ہے چنار اُس سے رُخِ گُل پہ جو ہو رنگ
بے مہری میں سیّار گُلستاں کی کہوں کیا
پھل دے اُنھیں جو نخل اُسے مارے ہیں یہ سنگ
جلتا ہے اُنھیں بخل و حسد اُس سے ہے افزود
چشم اُن کی ہے جو غنچہ پہ دل اُن سے بھی کچھ تنگ
اس بحر میں وہ نام بزرگ آوے سو کیونکر
چُلّو میں سمندر نہیں آتا ہے کسی رنگ
رُستم کو خبر ہو کہ ترا اُس پہ ہے آہنگ
جیوے بھی جو یہ سُن کے تو کھایا نہ لگے انگ
چار آئینہ گردوں ہو اگر تن پہ عدو کے
آگے تری شمشیر کے ہے بھیڑ کا چو رنگ
آتش رہے یوں آب میں انصاف سے تیرے
آئینے میں جس شکل ہو عکسِ رُخِ گلرنگ

کیتے سخنِ واقعی میں عرض کئے ہیں
خواہ اُن کو گہر سمجھے تو اب خواہ اُنھیں سنگ
پروازِ ہُما جب ہو سوئے اوجِ سعادت
شہباز کا طالع کے ترے اُس پہ رہے چنگ

سوؔدا اُن لوگوں میں نہیں تھے جو صرف مدح اور ستائش ہی تک اپنی بلندیٔ فکر کو محدود رکھتے وہ حمد و نعت کے علاوہ ہر رنگ میں ڈوبتے اور اُبھرتے تھے۔ واقعہ نگاری کے خیال سے ہم نے قصد کیا تھا کہ اُن کے اُس قصیدے سے بھی چند اشعار کا انتخاب کریں جو شہر آشوب کے نام سے کلیات میں درج ہوا ہے اس لئے ہم نے اس موقع پر مختصراً چند شعر کافی خیال کرکے درج کر دیئے ہیں۔

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعوےٰ نہ کرے یہ کہ مرے مُنہ میں زباں ہے
میں حضرتِ سوؔدا کو سُنا بولتے یارو
اللہ رے اللہ ہے کیا نظم بیاں ہے
ہر گھر میں وہ چاہے کہیں فوّارہ سا چھوٹوں
ہر کوچے میں جوں آب چکا بزوہ رواں ہے
یاں فکرِ معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر
آسودگی حرفیست نہ یاں ہے نہ وہاں ہے

اس کے بعد ایک قصیدہ حضرت امام کاظمینؑ کی شان میں لکھا ہے۔ یوں تو پورا قصیدہ قابل دید ہے اور اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قصیدے میں جو جو باتیں ہونی چاہئیں اُنھیں پوری طرح سے کس حد تک ادا کیا ہے۔

ہے پرورش سخن کی مجھے اپنی جاں تلک
جوں شمع زندگانی ہے میری زباں تلک

خاموشی آئینے کی کہے حال روئے خلق
روشن دلوں کا کام نہ پہنچے زباں تلک

ہے ظالموں کو سختیِ دوراں مدد کہ تیغ
کاٹے دوچند پہنچے جو سنگِ فشاں تلک

بے ماتم اس چمن میں نہیں خندۂ طرب
ہے کسوتِ کبودِ گُلِ زعفراں تلک

گر بن کجی ہو راستی دُنیا میں پیش رفت
وابستہ ہو نہ تیر کا چلنا کماں تلک

مطلع

کیفیتِ بہار ہے گلشن میں یاں تلک
بُلبُل سے مست ہو گئے اب باغباں تلک

رکھئے قلم کو مدح میں ایسوں کی سرنگوں
سجدہ کریں ہیں جن کو زمین و زماں تلک
گُلچیں کی کیا مجال جو توڑے چمن کے پھول
صورت سے گُل کی لرزہ ہے بادِ خزاں تلک
مارِ سیہ سے لیتے ہیں وہ کام اندنوں
وابستہ جانتے ہیں جسے ریسماں تلک
ہزیان خواب میں جو پڑھے پوتھی برہمن
کلمہ جگا کے اُس کو پڑھادیں یہاں تلک
جس وقت یہ سخن دہنِ پیرِ عقل نے
پہنچا گہر کی طرح مرے گوشِ جاں تلک
ناگہ اُنھیں کے ذرّۂ خورشیدِ فضل سے
پہنچا دیا یہ مطلعِ انور زباں تلک
جس جا کہ مرغِ قدر تمھارا ہے بال زن
جبریل کا نہ وہم گیا اُس مکاں تلک
اُس کی غرض ستائشِ ہمّت نہ ہو سکے
جس کا کہ ایک رتبۂ بخشش ہو یاں تلک

جوں غنچہ آسماں نے مجھے بہر عرضِ حال
دیں نشو زبانِ دہن ولیکن سبھی ہیں لال
ہرگز کسی گرہ کے لئے جز خراشِ دل
مارا نہ آسماں نے کبھی ناخُنِ ہلال
پارے کو دے ہے رتبۂ اکسیر بعد مرگ
دولت کبھی کسی کو نہ دی اُن نے بے زوال
ہم پر سدا رکھے مے گلرنگ کو حرام
خونِ بہارِ تیغِ خزاں پر کرے حلال

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مرزا کے کلام میں ابتذال بے حیائی، فحاشی بھی پائی جاتی ہے۔ اس لئے آج اِن فضولیات میں پڑنا، تضیعِ اوقات اور لاحاصل ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خیال صحیح و سچ ہو۔ جذبات غالباً اُن بے اختیار چیزوں کا نام ہے جو خود بخود پیدا ہوں جن میں آورد نہ ہو۔ جس جگہ پھول ہوتا ہے وہاں کانٹا بھی ہوتا ہے۔

جس کسی کے کلام میں انشائے شاعری کی زائد خوبیاں نظر آئیں اور کم بُرائیاں دکھلائی پڑیں ایسے محل اور موقع پر نکتہ چیں نظریں اور عیب جو نگاہیں خوبیوں پر زائد نظر رکھتی اور عیوب کو

نظر انداز کر دیتی ہیں۔

اِسی کے ساتھ یہ بھی تسلیم ہے کہ اُن کے کلام میں جدّت طرازی بھی ہے۔ استعارات بھی ہیں۔ نادر تشبیہات بھی ہیں۔ سادہ اور نیچرل خیالات بھی ہیں تو پھر باقی کونسی چیز رہ گئی۔ سرفراز الدولہ حسن رضا خاں بہادر کی شان میں جو قصیدہ لکھا ہے اُس کی زمین رواق وسماق ہے۔

عزیز عقل کو سودا کی تھی جدائی شاق ــــ سو اُس کئے وہ پھر آیا ہے بسکہ تھا مشتاق

میں از قبیل جواہر ہوں باز زیر فلک ــــ ولیک سختی طالع مری ہے سنگِ سماق

سپہ گری میں گو گزرا شباب کا عالم ــــ نہیں وہ عمر کہ اب آؤں میں بکار سیاق

جو باندھوں اس پہ کمر اب تو بندھے اس طرح ــــ کہ جوں کمان کا قبضہ بندھے مقابلِ قاق

سوداؔ کے قصائد کے نمونے بھی نظر سے گزر چکے اور اس کا اندازہ بھی ہو گیا کہ اُن کی قادر الکلامی اب محتاج بیان نہیں ہے۔

اب آخر میں ایک قصیدے کے چار شعر اور بھی دیکھ لینا چاہیئے کہ اس مشکل زمین میں کیا گلفشانی کی ہے ؎

سحر و صولت کے سامنے تیرے ــــ سامری بھول جائے اپنی پڑھنت

تیری ہیبت سے نہ فلک کے تلے ــــ کانپتی ہے زمیں کے بیچ گرگٹ

زہرۂ برق آب ہو جائے ــــ تیرے توسن کی گر سنے کڑکنت

مرزا کے قصائد کی تعداد اس قدر زائد ہے کہ اُس کا اگر اور انتخاب کیا جائے تو اُس کا حجم اِس کتاب سے بہت بڑھ جائے اس لئے اختصار کے ساتھ چند اشعار درج کر دیے۔ اور اگر ہجویں اور مثنویاں اور دیگر چیزیں درج کی جاتیں تو حجم ضرور بڑھ جاتا مگر دلچسپی یقیناً گھٹ جاتی۔

سوداؔ کی ہجو

ہجو لکھنے میں مرزاؔ کو خاص طور پر دلچسپی تھی اور اُسی کے ساتھ ظرافت کی چاشنی ساتھ ساتھ قائم تھی۔ مرزاؔ کا یہ خزانہ اس درجہ پُر تھا کہ بڑھاپے تک اس میں ذرا بھی کمی نہیں ہوئی۔ اُن کی طبیعت کے جوش اور ولولے کسی نوخیز حسین کے اُبھار کی طرح کبھی دب نہ سکے۔ مرزاؔ کا ایک غلام غنچہ نام ہمیشہ قلمدان لئے ساتھ رہتا تھا۔ اُدھر مرزاؔ کے چہرے کا رنگ بدلا غصّے نے اور زور پکڑا فوراً قلمدان طلب ہوا۔ مروّت۔ محبت۔ دوستی سب کچھ غائب غُلّہ مراسم اور ملاقات سب کچھ گاؤ خورد۔

امیر، غریب، عالم، فاضل، عابد، زاہد کوئی بھی کیوں نہ ہو اُس کا اُن کے خدنگ نظر سے بچنا محال اور غیر ممکن و دشوار ہو جاتا تھا اور وہ سب کو ایک گھاٹ اُتارتے تھے۔ مگر ہر فرعونے را موسےٰ۔ میر ضاحکؔ

فدوی۔ مکین۔ بقا یہ وہ لوگ تھے جو مرزا کے مدِ مقابل خم ٹھونک کر اکھاڑے میں اُتر پڑتے تھے۔

بقا

بقاء اللہ نام بقا تخلص اکبرآباد وطن۔ دہلی میں پیدا ہوئے، لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ حافظ لطف اللہ خوشنویس کے بیٹے تھے۔ میر و مرزا کے ہمعصر تھے۔ شاہ حاتم سے ریختی کی اصلاح لیتے تھے۔ فارسی میں مرزا فاخر مکین کے شاگرد تھے۔ طبیعت فنِ شاعری کے لئے بہت مناسب تھی۔ اردو زبان بہت صاف تھی۔ میر اور مرزا دونوں میں سے کسی کو بھی خیال میں نہیں لاتے تھے۔

میر ضاحک

میر ضاحک، اُن کا نام سید غلام حسین تھا۔ اُن کے اجداد ملک ہرات سے آکر دہلی میں قیام پزیر ہوئے تھے۔ آدمی خوش طبع، خندہ جبیں خوش مزاج اور ظریف الطبع تھے۔ صورت مقدس، وضع پرانی، آج

اُن کا نقشہ اور حلیہ لکھا جائے تو گھنٹوں ہنسی آئے۔

غرضکہ سوداؔ سے اور میر ضاحکؔ سے ذرا سی بات پر اَن بَن ہو گئی۔ چونکہ ابتدائی غلطی میر ضاحک کی تھی یعنی پہلے ہجو سودا کی اُنھوں نے لکھی۔ سودا کو اطلاع ہوئی تو یہ خود میر صاحب کے پاس گئے اور کہا کہ آپ بزرگ ہیں خرد۔ آپ سیّد ہیں آپ کے جد کا غلام، کہاں میں کہاں آپ۔ ایسا نہ کیجئے کہ مجھ گنہگار کے مُنہ سے بھی کچھ نکل جائے اور آخرت میں مجھے روسیاہی ہو۔

میر ضاحک نے کہا کہ نہیں بھائی یہ تو شاعری ہے، اس میں خردی و بزرگی سے کیا بحث اور غرض۔ سودا نے کہا بہت بہتر۔ غرضکہ طرفین سے برابر جنگ چھڑی رہی۔ نہ اُنھوں نے کچھ رعایت برتی نہ اُنھوں نے۔ میر حسن میر ضاحک کے سعید بیٹے تھے مگر بدقسمتی سے سودا کے شاگرد تھے۔ جس وقت میر ضاحک کا انتقال ہو گیا اور مرزا سودا اپنے شاگرد میر حسن کے پاس تعزیت کی غرض سے گئے تو اپنے شاگرد سے اپنی ہرزہ گوئی پر عذرات کئے اور کہا کہ سیّد مرحوم نے دنیا چھوڑ دی تم اُن کے سعید بیٹے ہو مجھ روسیاہ سے جو کچھ گستاخی ہوئی ہو اُسے معاف کرو۔ اور نوکر سے فوراً دیوان منگوا کر جس قدر کلام ہجو تھا چاک کر ڈالا۔

میر حسن نے بھی یہ سعادت برتی کہ اُسی وقت اندر جا کر باپ کا

دیوان اُٹھا لائے اور جس قدر ہجویں سودا کی بابت تھیں پھاڑ ڈالیں۔ مگر سودا کے کلام کو چونکہ بہت کچھ مقبولیت ہو چکی تھی اور بچے بچے کی زبان پر اُن کا بہت زیادہ کلام موجود تھا بہت کچھ باقی رہ گیا۔

میاں سکندر اور میر ضاحک سے بھی خوب خوب چوٹیں چلا کرتی تھیں۔ میر مہدی حسن فروغ جو شباب کے شاگرد تھے اور بحر کے قدیم دوست اور ہم مشق تھے اور سید انشا کے خاندان میں تھے۔ آتش و ناسخ کے مشاعرے دیکھے ہوئے بیان کرتے تھے کہ ایک روز مرزا سلیمان شکوہ کے پائیں باغ میں تختوں کی نشست تھی۔ مسند پر شاہ عالم تھے۔ مرزا سودا اور میاں سکندر مرثیہ گو پہلے سے موجود تھے کہ میر ضاحک تشریف لائے جو پرانی وضع میں ملبوس تھے (جو اُس وقت لائق انگشت نمائی تھی) اُن کو دیکھ کر صاحب عالم کو کچھ ہنسی اور کچھ مسکراہٹ آگئی۔ مزاج پرسی کے بعد حقہ آیا۔ صاحب عالم نے مرزا سودا سے کہا کہ کچھ ارشاد فرمائیے۔ صاحب عالم کی غرض اُس وقت دراصل فقط چھیڑ چھاڑ تھی۔ سودا نے کہا کہ میں نے چند دنوں سے اِدھر کچھ کہا نہیں ہے مگر میاں سکندر نے ایک مخمس کہا ہے۔ صاحب عالم نے فرمایا کہ پڑھیے۔

ابھی سودا نے پہلا ہی بند پڑھا تھا کہ میر ضاحک اور میاں سکندر

فوراً ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ سکندر حیران کہ یہ کیا آفت آگئی۔ غرض کہ بہ مشکل دونوں الگ کئے گئے۔

لگے ہاتھوں میر ضاحک کی ہجو کے چند اشعار سُنتے جائیے۔

ہے عجیب و غریب زیرِ سما | ایک یاں صورت آشنا اپنا
کیا حریصِ طعام ہے یہ پلید | حارثِ سنگدل کا ہے وہ مرید
دہر نے یہ بڑی حماقت کی | اپنے گھر اُس کی لاضیافت کی
لاکر ایسا ہی ایک دستر خوان | طول و عرض اُس کا کیا کروں میں بیان
شرق سے تا بہ غرب بچھوایا | اُس پہ تنہا اُسی کو بٹھلایا
اُس پہ نعماتِ حق جہاں تک تھے | یاں سے آگے وہ اُس کے واں تک تھے
اس میں کچھ اُس سے ہوگئی اَن بن | اُسے اُٹھوا دیا پکڑ گردن
ہاتھ بھی یہ نہ ڈالنے پایا | چاٹتا ہونٹ اپنے گھر آیا
گھر میں اب جس کے دیگچہ کھڑکے | در پہ اُس کے یہ بیٹھے یوں اڑ کے
کھانا آوے تو اس طرح ٹوٹے | جیسے کوئی کسی کا گھر لوٹے

بارے لُقمہ تو اس طرح بدذات
جیسے جھاڑے کوئی بیٹے کے ہات

فدوی

فدوی تخلص۔ مکند رام نام۔ پنجاب وطن۔ پہلے ہندو تھے پھر مسلمان ہو گئے تھے۔ علم تو ضرور کم تھا مگر طبیعت شاعری کے ساتھ بہت مناسب تھی۔ شعر اچھا کہتے تھے۔ صابر علی شاہ کے شاگرد تھے۔ وضع فقیرانہ۔ مشاعرے میں جب کبھی آتے کبھی تو کھڑے کھڑے غزل پڑھتے اور کبھی کبھی بیٹھ بھی جاتے تھے مگر ادھر غزل پڑھی اُدھر چمپت ہوئے۔ ایک بار احمد شاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ بادشاہ نے ایک ہزار نقد۔ گھوڑا اور تلوار انعام میں دی۔ اب کیا تھا دماغ میں خودی کی ہوا بھری ملک الشعرائی کا دعویٰ کر بیٹھے اور مرزا رفیع السودا پر خوب خوب اعتراض جھاڑے اور اس طرح طرفین میں ہجو بازی جاری رہی۔ مرزا نے اپنے کلیات میں اُن کی بھی کئی ہجویں لکھی ہیں۔ جن میں سے بخیال اختصار صرف سات شعر درج کر دئے ہیں۔

فدویا بولے ہے میں ہوں اُستاد ۔۔۔ میں کیا فن شاعری ایجاد
آکے شیدا جو ہو مرا شاگرد ۔۔۔ گوشِ دل سے سُنے مرا ارشاد
مرتبہ اُس کے شعر کا ہو یہ ۔۔۔ سخن اُس کا سخن کی ہو ایجاد
رفتہ رفتہ سُنا یہ شیدا نے ۔۔۔ کہا اُس نے کہ خانماں برباد

پھینکدی اُس کی کھود کر بنیاد — کے گھر کو تو نے ویراں کر
بیت سعدیؒ کی ہے مجھے یہ یاد — کس طرح سے ترا میں ہوں شاگرد

کس نیاید بزیر سایۂ بوم
ور ہُما از جہاں شود معدوم

غرض فدوی کی ہجو کی بابت بیسوں شعر کلیات میں موجود ہیں۔ چنانچہ ایک مطول نظم میں سے مجملاً چند شعر اور لکھے جاتے ہیں۔

سب یہ کرے ہے طعن وہ جتنے کہ اُستاد ہیں — شعر پہ میرے بھی اب اُن کے یہ ایراد ہیں
اتنے لیے صاحبو آکے یہ ہم سے لڑے — تا اُنھیں جانے کوئی یہ بھی ہیں شاعر بڑے
ہوتے ہیں وہ ہی بڑے جن کو بڑا حق کرے — اپنے کیۓ سے بڑا اُن کو بھی احمق کرے
شعر تو بے ربط و پوچ کہنے سے اب شوق ہے — تسمیہ اُنھیں خلق میں شہرے سے یہ ذوق ہے
شاعر ہوا ہے فدوی کیا شاعروں کا بلّا — مادہ وہ زن تخلص یاروں کا مسخرلّا
معقول شعر اُس کا ہرگز سنا نہ ہم نے — جز ٹیں ٹیں ٹاں ٹاں ٹوں ٹوں اور ٹخ ٹخورلا
کوئی باسم اُس کے گھر کا پتا نہ پاوے — اُلّو جو کہہ کے پوچھو بتلادے سب محلاّ

حسرت سے دھول دھپّا لڑتا ہے شاعری پر
یاں تک کہ فخر اپنا کرتا ہے یہ بلَلّا

مرزا فاخر مکین

کشمیری النسل تھے۔ اول فتوت حسین خاں کشمیری سے اصلاح لیتے تھے پھر عظمائی کشمیری کے شاگرد ہوئے۔ کمال میں گنجائشِ کلام نہیں۔ صحتِ الفاظ اور تحقیق لغت میں بڑی کوشش کی تھی۔ دیوان نے رواج نہیں پایا مگر بیاضوں میں اشعار اور سودا کی جو ہجو لکھی ہے موجود ہے۔ سودا نے بھی تضمین کر کے انھیں پر اُلٹ دیا ہے۔

کچھ اشعار سودا نے کتاب عبرۃ الغافلین میں لکھے ہیں۔ زمانے نے اُن کی بہت قدر کی۔ اطرافِ لکھنؤ اور لکھنؤ میں سیکڑوں امیر و غریب اُن کے شاگرد پیدا ہو گئے تھے یوں تو ہمیشہ توکل تھا مگر بد دماغی نے اُس میں زائد رونق بڑھا دی تھی۔

اُسی زمانے میں ایک شخص اشرف علی خاں شریف النسل تھے۔ اُنھوں نے پندرہ سال کی محنت سے فارسی کے تذکروں اور اُستادوں کے دیوانوں سے ایک انتخاب مرتب کیا تھا۔ فارسی شعرا میں فاخر نامور تھے۔ یہ اُن کے پاس تصحیح کی غرض سے لے گئے۔ فاخر نے کچھ اقرار کچھ انکار کے بعد رکھ لیا مگر ہٹ دھرمی کی آنکھ اور بے انصافی کی نظر سے بڑے بڑے اُستادوں کے اشعار کو اصلاح کی تیغ سے زخمی کیا

اور کہیں خنجرِ برّاں سے قتل بھی کیا۔

اتفاق سے اشرف علی خاں کو اطلاع ہوئی وہ زبردستی کتاب اٹھا لائے۔ دیکھا تو کتاب اصلاحوں سے مشبّک۔ مغموم اور رنجیدہ کتاب لاکر سوداؔ کے سامنے رکھدی اور کچّا چٹھا کہہ کر درستی کی خواہش ظاہر کی۔ مرزاؔ نے بہت کچھ عذر کیا اور کہا کہ مجھ کو فارسی میں مشق نہیں ہے۔ اردو میں چند الفاظ جوڑ گانٹھ لیتا ہوں۔ دُنیا والوں نے خدا جانے کیونکر قبولیت کا سرٹیفکٹ مجھے دیدیا ہے۔ مرزا فاخر مکینؔ فارسی داں۔ فارسی گو صاحبِ کمال۔ انھوں نے جو کچھ کیا ہوگا سمجھ کر۔ اگر اصلاح مدِ نظر ہے تو شیخ علی حزیںؔ کے شاگرد شیخ ہدایت اللہ شناؔ۔ میر شمس الدین فقیرؔ موجود ہیں۔ یہ اُن لوگوں کا کام ہے۔

اشرف علی خاں نے کہا کہ فاخرؔ ان لوگوں کو خیال میں بھی نہیں لاتے۔ غرضکہ بہت اصرار کے بعد مرزاؔ نے انتخاب مذکور رکھ لیا۔ پڑھا تو جس قدر باکمال اور مسلم الثبوت شاعر سلف سے آج تک گزر گئے ہیں انھیں فاخرؔ نے کُند چھُری سے حلال کیا ہے۔

یہ رنگ دیکھ کر مرزاؔ کو بہت رنج ہوا اور مرزاؔ نے ایک رسالہ عبرۃ الغافلین لکھ ڈالا۔ اور فاخرؔ کی غلط فہمیوں کو انشاپردازی کے

اصول کے اندر نظر ڈال کر خوب دھجیاں اُڑائیں۔ مرزا فاخر مکین کو اطلاع ہوئی۔ گھبرائے۔ چاہا کہ زبانی بات چیت۔ سلام و پیام سے یہ داغ دُھل جائیں اور بقاء اللہ اپنے ایک شاگرد کو بھیجا۔ مرزا سے اور بقا سے خوب بحث اور گفتگو ہوئی اور اس ترکیب سے میاں فاخر کی یہ تدبیر کچھ کارگر نہ ہوئی۔ مجبوراً فاخر دوسری چال چلے۔ چونکہ اُس زمانے میں شیخ زادگان لکھنؤ کا بہت دور دورہ تھا مرزا کی بیخبری میں یہ لوگ بلوہ کر کے گھر پر چڑھ آئے اور مرزا کے پیٹ پر چھری رکھ دی اور کہا کہ جو تم نے کیا ہے وہ تو سب ہو چکا اب ہمارے اُستاد فاخر کے سامنے چل کر فیصلہ کرو۔

مرزا یوں تو گُل اور بُلبُل کے صدہا مضامین تیار کر لیتے تھے مگر یہ مضمون تھا ذرا پیچیدہ۔ مرزا کی سمجھ میں نہ آیا اور سب باتیں بھول گئے۔ خود تو میانے میں سوار ہوئے جزدان غلام کو دیا اور اُن کے ساتھ ہوئے چاروں طرف سے شیطانی لشکر۔ یہ بیچارے بیچ میں۔ چوک میں پہنچے تو اس موقع پر اُن لوگوں نے مرزا کی بے عزتی کا منصوبہ کیا اور ایک نیا جھگڑا نکال کر تکرار پر آمادہ و تیار ہو گئے۔ مگر خدا جسے عزت دیتا ہے اُسے کون بے عزت کر سکتا ہے۔ اتفاق کی بات کہ سعادت علی خاں کی سواری نکلی مجمع دیکھ کر سواری روکی۔ حال دریافت کیا اور اپنے ساتھ

مرزا کو ہاتھی پر بٹھا کر چلے گئے۔ آصف الدولہ حرم سرا میں دسترخوان پر تھے۔ سعادت علی خاں نے اندر جا کر بھائی سے کہا بڑا غضب ہوا آپ کی حکومت اور شہر میں یہ قیامت۔

آصف الدولہ نے کہا۔ کہاں کیوں بھئی خیر باشد۔ اُنھوں نے فرمایا۔ مرزا رفیع السّودا جنھیں باباجان نے برادر شفیق مہربان لکھ کر خط بھیجا تھا بہت آرزوؤں سے بلایا تھا اور وہ نہ آئے۔ آج وہ یہاں موجود ہیں اور ایسی حالت میں ہیں کہ اگر میں اُس وقت نہ پہنچ جاتا تو اُنھیں اس بیچارگی کی حالت میں شہر کے بدمعاشوں نے بے حرمت کر ڈالا ہوتا۔ اور پھر سارا ماجرا بیان کیا۔ فرشتہ خصال آصف الدولہ گھبرا کر بولے کہ مرزا فاخر نے اگر ایسا کیا تو مرزا سودا کو کیا ہم کو بے حُرمت کیا۔ باواجان نے اُنھیں بھائی لکھا تو ہمارے چچا ہوئے۔ سعادت علی خاں نے کہا اس میں کیا شبہہ اور شک ہے۔ اُسی وقت باہر آئے۔ پورا قصہ سُنا۔ بہت غصّے ہوئے اور حکم دیا کہ شیخ زادوں کا پورا محلہ کھدوا کر پھینک دو اور شہر سے نکلوا دو۔ اور فاخر جس حال میں ہو حاضر کرو۔ اس موقع پر سودا کی نیک نیتی دیکھئے کہ ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ جناب عالی ہم لوگوں کی لڑائی کاغذ اور قلم کا میدان ہے۔ آپ ہی فیصل ہو جاتی ہے۔ حضور کی مداخلت کی ضرورت نہیں ہے۔ جس قدر مدد حضور کے اقبال سے پہنچ

وہ بہت کافی ہے۔ اس سے زائد غلام کی بدنامی ہے۔ غرضکہ مرزا رفیع السّودا وہاں سے رخصت ہوئے اور نواب نے سپاہی بھی ساتھ کر دیئے۔ حریفوں پر جب راز کھلا تو اُمرائے دربار کے پاس دوڑے۔ اُنھوں نے یہ رائے دی کہ یہ معاملہ کسی روپئے یا جاگیر کا نہیں ہے۔ مرزا فاخر کو ساتھ لے جاکر مرزا رفیع السّودا سے خطا معاف کراؤ۔

دوسرے دن مرزا فاخر کو آصف الدولہ نے دربار میں بلایا اور کہا کہ تمھاری طرف سے بہت سخت اور نازیبا حرکت ہوئی۔ اگر شعر کے مردِ میدان ہو تو سودا کے مقابل ہو کے لکھو۔ فاخر نے کہا کہ ایں از مانمی آید۔ آصف الدولہ نے بگڑ کر اور غصّہ ہو کر کہا "درست ہے۔ ایں از شما نمی آید وایں آمد" کہ شیاطین خود را بر سر مرزائے بیچارہ فرستادند واز خانہ ببازار کشیدند ومیخواستند کہ ابرویش بخاک ریزند"

اور سودا کی طرف اشارہ کیا۔ سودا نے فوراً یہ رباعی پڑھی۔

توفخرِ خراسانی وفا ساقط ازو گوہر بہ دہاں داری ورا ساقط ازو
روزاں وشباں زحق تعالےٰ خواہم مرکب وحدت خدا و باساقط ازو

غرضکہ جھگڑا بکھیڑا رفع دفع ہوا۔ مگر دور سے چوٹیں برابر چلا کیں۔

خلاصہ عبرۃ الغافلین

اس رسالہ میں پانچ فصلیں ہیں۔ پہلی فصل ہیں سبب تالیف۔ دوسری فصل میں اُن اُستادوں کے نام اور اشعار ہیں جن پر فاخر نے خط کھینچ دیے یعنی قلم زد کیا ہے۔ تیسری فصل میں شعرائے ماضیہ کے اشعار پر جو اصلاح فاخر نے دی ہے۔ چوتھی فصل میں اُن اشعار کو دکھلایا ہے جن پر فاخر نے اعتراضات کیے ہیں۔ پانچویں فصل میں فاخر کے اعتراضات پر تنقید۔

اس صورت میں فصل اوّل چنداں محتاجِ تشریح نہیں فصل دوم میں چھیاسٹھ شاعروں کے اشعار کو قلم زد کیا ہے۔ فصل سوم میں جستہ جستہ اشعار بخیالِ طوالت لکھے ہیں۔

عزّت

برسبک روحی ماکس نہ تو آمد در زیست چوں ہوا در ہمہ آفاق بود خانۂ ما

مصرعِ ثانی پر فاخر کی یہ اصلاح ہے ع

"بہ چو بو در ہمہ آفاق بود خانۂ ما"

سودا لکھتے ہیں کہ ہر چند بو بھی سبک رو ہے لیکن آفاق سے اُس کا تعلق نہیں ہے پس بہ سبب بو کے عزّت کا شعر بالکل ٹھیک ہے۔

اگر فاخر کی اصلاح نکتہ رسوں اور نکتہ سنجوں کی قبیح اور نادرست ہے اور اصلاح ہی منظور تھی تو آفاق کو بھی بدل دیتے اور یوں لکھتے۔

"ہیچو بو درہمہ گلزار بود خانۂ ما"

غنی بیگ

ماہِ نَو گرچہ رفت بر گردوں   زیر چاقِ کمان ابرو ِ اوست

مرزا فاخر نے مصرع دوم میں چاق کی جگہ طاق لکھ کر اصلاح دی ہے۔ سودا کس لطیف پیرائے میں اس پر یہ مضحکہ اُڑاتے ہیں کہ "فاخر نے حقیقتاً حقِ شاعری ادا کر دیا اور اس جد ید اصلاح نے شعر میں دو لطف پیدا کر دیے۔ اوّل یہ کہ طاق اور ابرو میں مناسبت ہے۔ دوم معشوق کے طول قامت کا مبالغہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ فاخر کی سمجھ اس بات سے قاصر رہی کہ زیر طاق کے معنی اس جگہ کچھ بھی نہیں ہیں اور اصلاح دینے والے خوب سمجھتے ہیں کہ زیر چاق کے معنی اصطلاحاً محکوم اور فرمانبردار کے ہیں خدائے تعالیٰ اُن کی غلط فہمی اور خود بینی کی اصلاح کر دے۔

مولانا روم رح

من باتو نمی گفتم کم دہ دو سہ پیمانہ   من مستم و تو مستی اکنوں کہ برد خانہ

مرزا فاخر مصرعِ ثانی پر یوں اصلاح دیتے ہیں۔

"من مست و تو گشتی مست اکنوں کہ برد خانہ"

سودا لکھتے ہیں کہ اس اصلاح کی فصاحت اور بلاغت اہل فہم پر بخوبی روشن ہے۔

علی حزیں

یکے شوریدہ باغے داد ترتیب　　نمودے از ریاحیں زیب و تزئیب
بآبِ دیدہ پروردے گلشن را　　زگلہا مژدہ دادے بلبلش را

مرزا فاخر کا یہ اعتراض ہے کہ تزئیب لفظ زیب سے مشتق ہے چنانچہ زیب بمعنی آراستہ مستعمل ہے۔ شاعر محض ناواقف ہے۔ اس صورت میں مزیب اور تزئیب عربی ترکیب ہے۔ اور اس قسم کی لغزشیں ناواقفوں کے کلام میں بہت پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ مزلف اور مرغن میں بھی اِسی قسم کی غلطی ہے۔

سودا کہتے ہیں کہ علی حزیں پر کنایتہً یہ اعتراض ہے مگر اصلیت یہ ہے کہ اشرف علی خاں نے بیاض نوشتۂ علی حزیں سے نقل کی ہے۔ شیخ مذکور کی شخصیت بہت بلند ہے اور اُن کا ہر لفظ تحریر میں ہو یا تقریر میں۔ تمام عالم کے لئے سند ہے۔ تزئیب کے لفظ کو جب اصل بیاض سے نقل کیا ہے تو اُن کے پاس اُس کی سند بھی ضرور ہوگی۔ مزید براں اکثر اُستادوں نے فارسی الفاظ کو معرب کر لیا ہے۔

اور اپنے اشعار میں انھیں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ حکیم خاقانی نے تحفۃ العارفین میں لکھا ہے "خاقانی ذوالخورشید بن رشد خراسان و نقی اوحدی صفاہانی در تذکرہ در تعریف مولانا فیضی قلمی نمودہ کہ جمعے متاخرین حتے مولانا عرفی افکارہ تیغ مہند طبعان از سوہانِ فطرت و مصاحبت او باصلاح آمدہ۔ باید دانست کہ مہند و رینجا در ہند ساختہ شدہ است ودہ دمد کوتری ہم مرد ولایت راو عالم و زباندان است۔ معہذا اہلِ عرب الفاظ عجم را معرب نمودہ اند" چنانچہ لفظ باہ فارسی ہے اس کو معرب کر کے مبہی استعمال کیا ہے۔ ہندرا مُہنّد۔ پس زیب را تزئیب کردن چہ نقصان دارد۔ اس کے علاوہ جس چیز کو علی حزیں نے جائز رکھا اُسے ناجائز سمجھنا چھوٹا مُنہ بڑی بات ہے۔

بالکل اِسی طرح مزلّف جس کا مادّہ زلف ہے اہلِ عجم کی زبان پر اس قدر چڑھا ہوا ہے کہ مصطلحات میں شمار ہوتا ہے اور اُس کی صحت میں کسی طرح کی گنجائش نہیں۔ کسی ایرانی اُستاد کا شعر ہے۔

موران خطِ بدو رخت صف کشیدہ اند
صد گونہ جور از تو مزلّف کشیدہ اند

شیخ علی حزیں رحمتہ اللہ علیہ

می گرفتیم بجاناں سرِ راہے گاہے　　او ہم از لطف نہاں داشت نگاہے گاہے
دو سہ روزست کہ دزدیدہ نگہ دیں عجبست　　نہ ثوابے زمن آمد نہ گناہے گاہے

فاخر نے پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں بجائے نہاں کے بما کی اصلاح دے کر شعر کے مزے اور لطف کو کرکرا کر دیا ہے اور دوسرے شعر کے مصرع آخر میں بجائے ثواب کے لفظ خطائے رکھکر شعر کو کُند چُھری سے حلال کر دیا ہے۔

شاعر کا مطلب تو صرف اتنا ہی تھا کہ دو تین روز سے تمھاری نگاہ کچھ دزدیدہ ہے آج سے پہلے کونسی بھلائی مجھ سے ظاہر ہوئی تھی کہ پہلے یہ حال نہ تھا اب کیا گُناہ ایسا مجھ سے سرزد ہوا جس کی پاداش میں نگاہ چُرائی جاتی ہے۔ اور یہ مفہوم شیخ کے دو تین روز کے لفظ نے صاف کر دیا۔ سخن فہم سمجھ لیں گے کہ گُناہ اور خطا کے الفاظ جو عوام کی زبان پر یک جا زباں زد ہیں اُن کو لکھ کر شعر کا مرتبہ بالکل گرا دیا اور سچ پوچھیے تو شعر کے مرتبے کو اعلیٰ علییّن سے اسفل السافلین کو پہنچا دیا۔

دیگر

زمرد کارِ دل روزگار می لرزد　　مگر چو راست کنم کوہسار می لرزد

مرزا فاخر نے اس کے مصرعِ اولیٰ میں بجائے لفظ روزگار کے کوہسار کی اصلاح کی ہے اور مصرع ثانی میں بجائے کوہسار کے روزگار بنایا ہے۔

فاخر کی اس اصلاح کو وہ عقل والے جو لطفِ سخن سے واقف ہیں اور شاعری سے بہرہ رکھتے ہیں خوب سمجھ سکتے ہیں کہ کام کو روزگار سے کیا تعلق اور استواری کمر کو کوہسار سے کیا نسبت۔

فصل چہارم = مکین کے اعتراضات پر سودا کے تنقیدی جوابات۔

راستی من یاد دانم کج کلاہِ خویش را　　من گدائے خویش کردم بادشاہ خویش را

سودا کہتے ہیں کہ فاخر کا اس شعر پر یہ اعتراض ہے کہ معناً اس بیت میں کوئی لطف پیدا نہیں ہوتا ہے لیکن فرض کیجیے کہ عاشق کو راستی کی یاد دلائی گئی ہے لیکن صرف راستی کے یاد دلانے سے شاہ گدا نہیں ہو جاتا۔

غرض یہ ہے کہ معشوق پر کج کلاہی کا اطلاق کیا جاتا ہے اور اگر مراد فقط راستیِ کُلاہ ہے تو شعر بے لطف ہے۔

زن سیرتان دورِ جہاں را صدا دہند　　ساقی گرفت ساغرِ مرد آزمائے را

سودا کہتے ہیں کہ اول تو زن سیرتان پر مردمی کا دعویٰ ثابت نہیں ہوا۔ اُس پر طرّہ یہ کہ ساغرِ مرد آزما کی صلاح بھی اُن کو دی جاتی ہے مگر وہ بیچاریاں مردی کا دعویٰ بھی کب کرتی ہیں پس جس کسی کے

ہاتھ میں ساغرِ مرد آزما ہو وہی اُنھیں صلاح بھی دے سکتا ہے کیونکہ دعوائے مردی بھی وہی رکھتا ہے نہ کہ عورتیں۔ آزمودن کا لفظ بھی اس میں موجود ہے جو اِسی کا طالب ہے۔

نظیری کا شعر پڑھیے۔

کار نظیری در رضا غم خوردن و خوش بودن است

دارم مے مرد آزما خوش باد شیخ و شاب را

نظَیری کا مدعا یہ ہے کہ رضائے الٰہی میں نظیری کا غم کھانا اور خوش رہنا ہے اور اِسی چیز کو اُس نے مے مرد آزما قرار دیا ہے۔ پس ہر شیخ و شاب سے اُس کا خطاب ہے کہ دونوں کو اِسی قسم کا دعوے ہے نہ یہ کہ جیسا فاخر کہتے ہیں۔ کہ شاعرِ مرد آزما کے لئے ساقیِ زن سیر تان کو صلائے عام دیتا ہے بھلا زن سیر تان نے دعوئے مردی ہی کب کیا تھا۔

فیضی

گردِ فنا شد ند حریفان بزم عشق بر خاک ریز جرعۂ مرد آزمائے را

جُرعہ کشی کا حوصلہ مرد جُرعہ آزما ہی کو ہوتا ہے اور گرد فنا شد ند سے مراد عالم میں نہ رہنا ہے چنانچہ ساقیؔ سے خطاب ہے کہ اس جُرعے کو زمین پر اُلٹ دو۔ غرضکہ نظیری ہر شیخ و شاب کو صلائے عام دیتا

ہے کہ اگر تم میں اس کی لیاقت ہے تو مے مردآزما سے لب آلودہ کرو۔ جس کے مقابلے میں فیضی کہتے ہیں" کہ حریفانِ بزمِ عشق گردابِ فنا میں غرق ہو جس کے اب کوئی معنی نہیں ہیں کہ مردآزما کو مُنہ میں لگانے کی جرأت کرے"۔ پس حیرت ہے کہ مکین کس سند سے شاعر مردآزما کے لئے زن سیرتان کو صلائے عام دیتے ہیں۔ اِس صورت میں ہر جاننے والے بلکہ نہ جاننے والے پر بھی صاف ظاہر ہے کہ مرزا فاخر کا علم اور فضل اور شعر و شاعری فیضی اور نظیری کے علم اور فضل اور شعر و شاعری سے وہ نسبت رکھتی ہے جو ذرّے کو آفتاب سے اور قطرے کو دریا سے۔

اگر فاخر نے زن سیرتان کو ساغر کے استعمال سے قبل مردآزما تصوّر کرلیا ہے لیکن اِن دونوں شاعروں نے جو قادرالکلام بھی ہیں اُن کا ذکر بھی مناسب نہیں خیال کیا اور یہ فخر مکین ہی کے لئے چھوڑ دیا تھا کہ وہ شاعر مردآزما کے لئے زن سیرتان کو صلائے عام دیں۔ اور یہ امر اُن کی طبیعت اور فطرت کے لئے بہت زیادہ موزوں بھی ہے۔ کیونکہ اُنھیں رعایتِ لفظی کے سوا اور کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ عام اِس سے کہ اُس سے کسی قسم کے معنی پیدا ہوں یا نہ ہوں۔ چنانچہ اُنھوں نے عورتوں اور مردوں دونوں کو ساغر کشی میں ایک

دوسرے کا حریف بنا دیا۔ اس سے کچھ بحث نہیں کہ شعر چاہے بالکل بے معنی ہوجائے لیکن رعایتِ لفظی کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا گوارا نہیں ہے۔ سودا ہماری رائے میں نزد مردِ میدانِ سخن درست وہر کہ از زن بیبرلی در پے معنی دانستن شعر مرزا فآخر جہل بکار برد عقل و شعور او ست۔

مکین

کجا روم چہ شوم چوں کنم چساں سازم　　گلا زمین بسر کوئے قاتل اُفتاد است

سودا کہتے ہیں کہ عالمِ عشق میں معشوق کے کوچے کو دونوں جہان پر باغِ ارم پر بھی فوقیت ہے اور عاشق کی تمنا ہمیشہ یہی رہتی ہے کہ معشوق کے کوچے میں دفن ہوجائے۔ لیکن جو شخص قاتل کے کوچے سے بھاگنے کا متمنّی ہو اُس کے لئے تو مناسب یہی ہے کہ کسی دوسرے راستے سے اپنے گھر کا رُخ کرے۔ ایسی عاشقی کو عقلا بوالہوسی سے تعبیر کرتے ہیں اور لفظ چہ شوم نے تو غضب ہی ڈھا دیا ہے یعنی اس لفظ نے کمال اضطرار پیدا کر دیا ہے۔ اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مکین نے اپنے آپ کو زاغ و زغن میں شمار کر لیا ہے اور شاعری کی فضا میں اُنھیں کی طرح اُڑ رہے ہیں۔ دیکھئے اسی مضمون کو امیر خسروؒ نے کس لطیف پیرائے سے ظاہر کیا ہے۔

کجا روم بکہ گویم چہ چارہ کار کنم　　کہ تیرِ عشق مرا در دروں چساں زدہ

یہ واقعہ ہے کہ جس وقت عشق کے تیر سے طائرِ جاں شکار ہوجاتا ہے اُس وقت معشوق کے کوچے سے عاشق کا نکلنا محال ہوجاتا ہے بلکہ ناممکن۔ لہذا خسرو کا قول ٹھیک اور درست ہے۔

مکین

ہمچو صبح و شفق از ذوقِ شہادت دلِ من   بر سرِ کوئے بتاں تیغ و کفن را برداشت

سودا کہتے ہیں کہ کفن کی تشبیہ صبح کے ساتھ بالکل صحیح ہے لیکن تیغ کی تشبیہ شفق سراسر غلط ہے چونکہ شاعر کو اپنی طبع غیور پر بہت دعویٰ ہے اسی لئے تیغ کو شفق سے تشبیہ دی ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ تیغِ خون آلودہ کو اگر شفق سے تشبیہ دی جائے تو چنداں ہرج نہیں ہے لیکن اس صورت میں خون آلودہ ہونے کا ذکر اور اظہار بھی تو ضروری تھا مگر تعجب ہے کہ اس شعر میں نہ تو تیغ کو خون سے آلودہ اور رنگین کرنا ظاہر کیا گیا نہ کسی جگہ اُس کے مخملی یا باناتی سُرخ رنگ کے غلاف کا ذکر آیا ہے۔

مکین

تقصیر حسبت مشت مزن پنجہ ام مپیچ   قرباں شوم بزور ازیں ناتواں مرنج

سودا پنجے میں پنجہ ڈالنا اور مکّے سے مکّے کا مقابلہ کرنا خاص پہلوان کا کام ہے۔ معشوق کا تو صرف یہ کام ہے کہ ناز اور ادا اور

غمزۂ معشوقانہ سے خود کو آراستہ کرے تاکہ عاشق کا دل مٹھی میں آجائے۔ قابلِ افسوس صورت اُس عاشق کے لئے ہے۔ جو کمزور و ناتوان ہو۔ کیونکہ اگر کسی قوی ہیکل سے مقابلہ ہو جائے تو سارا حال کھل جائے۔ پنجے اور کلائی کا تلازمہ پچھلے شعرا بھی جا بجا باندھ گئے ہیں مگر اُس کی صورت ہی جُدا گانہ ہے۔

صائبؔ

دست پیچیدن و دل بردن و پنہاں گشتن ہر چہ می گوئی ازاں موئے میاں می آید

نکہتؔ

نگہ فریفتۂ آں دو نرگسِ سیہ ام کہ چشمِ داغِ دلم سرمہ ناک می گردد

سوداؔ۔ آج تک چشمِ سرمہ ناک نگاہ سے نہیں گزرا ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ جس محل و موقع یا جگہ پر رنگ کا ظاہر کرنا منظور ہوتا ہے اُس جگہ پر سرمہ گوں۔ نیلگوں۔ میگوں۔ گلگوں استعمال ہوتے ہیں۔ اور ناک کا لفظ صفت کے مقام پر عموماً بڑھاتے ہیں۔ مثلاً غمناک۔ آتشناک غضبناک۔ اس کے علاوہ سرمے کے ساتھ چشم کا استعمال اہلِ زبان کے کلام سرمہ آلود۔ سرمہ سا تو نظر سے ضرور گزرا مگر یہ نکہتؔ کا خاص ایجاد کردہ سرمہ ناک ہے۔

مکینؔ

پارہ می کرد دل از شوق گریبانے را   دست در دامنِ یار است چہ می باید کرد

سوداؔ۔ یہ بھی خوب کہی۔ جس وقت دامنِ یار ہاتھ آجائے تو اُسے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی آرزو کس وجہ سے لازمی ہے۔ کیا اوندھی سمجھ ہے۔

نظیری

شمارے تا سحر دستم بہ زلفِ درہمی دارد   گریبانم گریبانست دامن دامنست امشب

اس شعر سے یہ نتیجہ تو خود ہی پیدا ہوا کہ جس وقت دامنِ یار یا زلفِ معشوق ہاتھ لگ جائے اُس وقت گریباں ٹکڑے ٹکڑے کرلے اور چلیتھڑا بنانے سے کیا فائدہ ہے۔

مکینؔ

نہ طوقِ چوں مکیںؔ در کعبۂ کوئے تواں کردن   نہ بوئے چوں زمیں بر خاک پائے می توانم زد

سوداؔ۔ زمین پاؤں کو چومتی ہے نہ کہ خاکِ پا کو۔ کیونکہ زمین خود ہی خاک ہے۔ اس وجہ سے زمین کی مثال سراسر غلط ہے۔

مکین

شب دل از آشفتگی گیسوے او در خواب دید   صبح از بیدار بختی روئے او در خواب دید

سوداؔ۔ اس شعر میں سوائے الفاظ کے جس میں ایک طرح کی مناسبت لفظی کہی جائے اور کوئی معنی اس مطلع کے میری فہم ناقص میں نہیں آتے۔

نتیجۂ بیدار بختی یہ نہیں ہے کہ خواب میں چہرۂ معشوق نظر آئے بلکہ بہتر یہ ہوتا کہ روزانہ معشوق سے بظاہر ملاقات ہو ورنہ ایسی بیدار بختی بدتر از آشفتگیِ دل سمجھنا چاہیئے۔
غالباً اہلِ سخن نے چشمِ دل اور گوشِ ہوش سے اس کا اندازہ کر لیا ہوگا۔
دوم یہ کہ مضمونِ بیت علے الرغم خلافِ مضامین اُستادان سابق ہے کیونکہ ہر ایک نے عاشق کو بے خوابی سے نسبت دی ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

گفتی شبے بخوابِ تو آیم ولے چہ سود چوں من بعمر خویش ندانم کہ خواب چیست

خواجہ حافظ علیہ الرحمہ

قرار و خواب ز حافظ طمع مدار اے دل قرار چیست صبوری کدام و خواب کجا

شعر دیگر از مثنوی

بگفتا وصل من در خواب دریاب بگفتم راضیم لیکن کجا خواب

بیدار بختی کا کیا عمدہ نتیجہ نکالا ہے کہ عاشق صبح اور شام خواب میں نظر آتا ہے۔

بکیس

از زنخدانش رواں سیلِ عرق از شرم شد رودِ نیل آخر نمود اعجاز یوسف چاہ را

سودا۔ عرقِ شرم آلود کو اکثروں نے پیشانی یا رخسار سے ضرور

نسبت دی ہے لیکن عرق کو زنخداں سے جوش مارنا ظاہر اُسنا نہیں گیا ہے نہ کہیں دیکھا گیا ہے۔ کسی اُستاد کا شعر ہے ؎

تا بر جبینِ او عرقِ شرم جوش کرد آئینہ را دُکانِ جواہر فروش کرد

اس کے علاوہ مرزا بیدلؔ کا شعر ملاحظہ ہو۔

بہ شبنم صبح ایں گُلستانِ بدن جوشِ بہار خود را
عرق چو سیلاب از جبیں رفت و ما نکردیم کارِ خود را

مکین

یافتم عشرِ عشیرِ دردِ خود محنتِ ایوبؑ کردم امتحاں

ایوبؑ کے ساتھ محنت کی جو نسبت دی گئی ہے وہ نہ دیدنی ہے نہ شنیدنی ہے۔ اگر کوہ کن سے نسبت دی جاتی تو شعر میں ایک حد تک ربط پیدا ہو جاتا۔ بجائے محنت ایوبؑ کے صبرِ ایوب کا اگر ذکر کیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔

مکین

در سینہ غم آلودہ چرا ماند دلِ من ناپاک ز آتشکدہ گر پاک بر آمد

سودا۔ دِل اور غم دونوں کو ناپاکی کے بجائے پاکی سے تعلق ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ دونوں زہرِ قاتل ہاں لیکن کسی اہلِ کمال نے غم اور دل کو ناپاک نہیں بتلایا۔

مکین

در محبت بہ دعا گریہ اثر داد مرا　　زہدِ خشک آنچہ دہد دامنِ تر داد مرا

سودا۔ زہدِ خشک نہ کوئی اثر رکھتا ہے اور نہ کچھ دیتا ہے۔ فاخر نے اس کو مثالاً پیش کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ لفظی مناسبت کے لحاظ سے اور دامنِ تر کی رعایت سے زہدِ خشک کو ٹھونسا گیا ہے حالانکہ زہدِ خشک زہر ہے۔

شعرِ اُستاد

بجائے چوب در ہانست زہدِ خشک عقبےٰ را
مبیں زنہار ایں تقوی شعارانِ ریائی را

مکین

آنرا کہ بازبانِ دراز آفریدہ اند　　گویا چو شمع بہر گداز آفریدہ اند

سودا۔ اس شعر میں شمع کی مناسبت زبان درازی اور گداز کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اُن کا ذہن اس طرف منتقل نہ ہو سکا کہ زبان درازی نام ہے اُس چیز کا جو تہذیب کی حد سے گزر جائے۔ اور ایسی فضول باتیں وہ کرے جس کو سُن کر رنج و غم پیدا ہو پس زبان درازی کو گدازی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگرچہ زبان درازی اور گداز کو شمع کی رعایت سے لائے ہیں جو صحیح ہے مگر اُستادوں نے شمع کی

زبان درازی کو یوں باندھا ہے۔
بپائے شمع شنیدم ز قیچی فولاد   زبان دراز سرِ خویش می دہد برباد

مکین

نرگس از چشمِ گُل اُفتاد ز سیم و زرِ خویش   طالب سیم و زر اے غنچہ دہن نتواں شد

سودا۔ اس شعر میں نرگس کا گُل کی آنکھ سے گر جانا ذرا بھی ثابت نہیں ہوتا اگر نرگس کو سیم و زر کی وجہ سے گُل کی آنکھ سے گر جانا ظاہر کیا جاتا ہے تو گُل بھی اس سے خالی نہیں ہے چنانچہ زرِ درد مشہور و معروف ہے۔ رہی نرگس وہ گُل سے کسی طرح اپنے مرتبے میں کم نہیں ہے اس لئے کہ اگر گُل کو رخسارِ معشوق سے نسبت ہے تو نرگس کو چشم معشوق سے۔ اربابِ فہم کہ جنھیں اس فن سے واقفیت ہے وہ خوب داد دے سکتے ہیں۔

مکین

شمع را گر آتشِ بیگانہ می سوزد مکین   از گدازِ خویش باشد احتراقِ تا ہنوز

سودا۔ (اوّل) آتشِ بیگانہ خلاف محاورہ ہے۔ (دوم) مصرعِ ثانی میں ہنوز بیکار و فضول ہے۔

مکین

خُردسالِ من نداند رسمِ مہجوری ہنوز   یکدم از طفلی ندارد طاقتِ طفلی ہنوز

سودا۔ غالباً تمکین نے دآبہ کی زبان سے یہ مضمون ادا کیا ہے۔
بالکل لغو اور مہمل ہے کوئی لطف اور نزاکت نہیں ہے۔

تمکین

زسامانے کہ دارد شمع باشد این سخن روشن
کہ من از دردِ سر در عالمِ اسباب می گریم

سودا۔ عالمِ اسباب دردِ سر کا مانع نہیں ہوسکتا۔ جس سر میں کہ درد ہو اگرچہ وہ عالمِ اسباب ہی ہوتا ہے اور وہ روتا ہے اس وجہ سے شمع کی تمثیل بیکار ہوئی جاتی ہے۔ اگر مقصد شاعر یہ ہے کہ میں عالم کی دردِ سری سے روتا ہوں تو مصرعِ ثانی میں جو الفاظ لائے گئے ہیں وہ بے معنی ہوئے جاتے ہیں۔

تمکین

زنجیرِ زلفِ یار گر افتد مرا بدست
خاقانِ چیں ہمیشہ فرستد خراجِ من

سودا۔ خراج شمشیر کے زور سے ہاتھ آتا ہے نہ کہ زنجیرِ زلفِ معشوق سے۔ اُس کو اس طرح لکھنا تھا "اگر تیغِ ابروے یار بدستِ من بودے خراج از خاقان می گرفتم"۔ چونکہ تمکین نے زنجیرِ زلف کو اوّل مصرع میں ظاہر کر دیا ہے اور اُسی تناسب سے خاقانِ چین کو مصرعِ ثانی میں زبردستی ٹھونس دیا ہے اور زنجیر کی رعایت سے گردن میں ڈالنا تحریر کیا ہے جو غلط اور محض غلط ہے۔

مکینؔ

آخر ندانم تا کجا اے طفل خو بازی کناں | کہ پا نہی بر بسملے گا ہے سرِ بر بسملے

سوؔدا۔ پا نہادن قاتل بر بسمل۔ از راہِ شوخی و طنّازی مُسلّم۔ لیکن بر سرِ بسمل نہادن آج تک کانوں نے سُنا بھی نہیں۔ معشوق میں اگر اس درجہ بچپن اور الھڑ پنا ہے کہ اُسے سر و پا کا فرق نہیں نظر آتا تو اُس پر قاتل کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔

مکینؔ

خون شد دلم از فکر کہ چوں دوش نشستی | از بہر چہ سر بردہ در آغوش نشستی

سوؔدا۔ عموماً عالمِ فکر و اندوہ میں سر بہ گریباں۔ سر بجیب۔ سر بزانو مستعمل ہے۔ مگر سر در آغوش۔ سُنا بھی نہیں۔ سند دیجئے۔

مکینؔ

تا قبا جامۂ رسوائیٔ خود کرد مکینؔ | نے کشد خصم گریباں و نہ دشمن دامن

سوؔدا۔ دشمن گریباں گیر و دامنگیر ہے۔ اور دامن کشی دوستی کی راہ سے ہے۔ چنانچہ کسی اُستاد کا شعر ہے۔

شورِ مرغانِ چمن دامنِ بردار کشید | ورنہ مارا ہوسِ دیدنِ گُلزار نبود

غور کرنے کی بات ہے کہ مرغانِ چمن کا شور جس نے ہم جنس سے دامن بردار کھینچا ہے، دوستی کی راہ سے ہے یا دشمنی سے۔ اگر سند

درکار ہے تو مکینؔ ہی کی غزل کا مطلع ہم لکھتے ہیں۔

گر بود دستر سے می کشمت من وردآن گوہرِ اشک بپا ریختہ دامن دامن

پس مکینؔ ہی انصاف سے دیکھیں کہ اس مطلع میں اُنھوں نے دامن کشیدن کا محاورہ بر بنائے دوستی استعمال کیا ہے یا بر بنائے دشمنی۔ اور یہ بات تو ہر شخص کی زبان پر ہے کہ چنیں آزار بہ کسے نباید رسانید کہ روزِ محشر دامنگیرِ من شود۔

اگر بجائے دشمن دوست ہو تو مصرعِ ثانی کے معنی مصرع اولیٰ سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ ورنہ فقط قافیے کی رعایت سے شعر کو بے معنی کر دینے سے کوئی نتیجہ نہیں ہے۔

مکینؔ

صیاد ما بہ بردہ گرفتست کارِ خویش گسترد و دام و زلفِ رسا را بہانہ ساخت

عاشق را بجولی زلف کردن لطف است ورد دام ہر جانورے را اسیر صیاد میکند

تعجب ہے کہ یہ معشوق صید کو دام میں گرفتار کرتا ہے اور زلف کا بہانہ کرتا ہے۔ اس صورت میں دام کو زلف پر ترجیح ہے اور زلف کا لطف بیکار ہو جاتا ہے۔ معشوق کو چاہیئے تھا کہ زلف سے گرفتار کرتا اور دام کا بہانہ کرتا۔ مگر مکینؔ کے اس شعر سے یہ مقصد پیدا ہوتا ہے کہ زلف سے صید کو گرفتار کیا اور پھندے کا بہانہ کیا؛

جو سراسر غلط ہے اور یہ مطلب شعر سے ہرگز پیدا نہیں ہوتا۔

مکین

زنداں جو گوش حرف موذن نمی کنند　　فریاد کرد و حیّ علیٰ را بہانہ ساخت

سودا۔ موذّن بیچارہ رندوں سے کیا بات کہتا ہے جبکہ وہ نہیں سُنتے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اس کا تعلق ناصح یا واعظ سے ہونا چاہیئے لیکن شعر سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ موذّن رندوں کی بابت شور اور فریاد کرتا ہے اور جس وقت وہ کچھ کہتا ہے تو حیَّ علیٰ صلوٰۃ کا بہانہ کرتا ہے۔

مکین

نمی دانم چہ نیرنگ و فسوں کرد آں حبیب امشب
کہ یک سو مدعی می نالد یک سو رقیب امشب

سودا۔ اب تک یہ کھُلا کہ عالم عشق میں مدعی کون ہے اور رقیب کون ہے۔

مکین

گرم می جوشد بغیر افسردہ خاطر از رمہست
ہر نفس نیرنگ اور رنگِ دگر سوز د مرا

سودا۔ دنیا میں ہمیشہ سے معشوق بے مہر اور سرد مہر خیال

کیا جاتا ہے پس معشوق کے لئے افسردہ خاطری کسی طرح زیب نہیں
دیتی ہے بلکہ افسردہ عاشق ہے اور آزردہ خاطری معشوق کی ہے۔ اِس
موقع پر لفظ افسردہ گرم جوشیدن کے لحاظ سے لایا گیا ہے جو بالکل بےمعنی ہے۔

مکین

چہ جائے غیر ہر کس عشق آں شیریں پسر دارد
پدر ناشاد ازیں رسوائے مادر زاد خواہد رفت

سودا۔ شاعر کا ارادہ اس موقع پر یہ ہے کہ غیر تو غیر اگر اُس کا
باپ بھی اُس کا عاشق ہو جائے تو رسوائی مادر زاد کی وجہ سے وہ دنیا سے
ناشاد جائے گا۔

حیرت ہے کہ کسی ایک شاعر نے بھی معشوق کے لئے رسوائی
مادر زاد کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے اور پیدائش کے وقت کی رسوائی
سے طفل کو کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔ ظاہر اس شعر میں معشوق کی رسوائی
اور فضیحت کے سوا اور کوئی خوبی بھی نہیں ہے۔

مکین

یک بار روئے غیر نگاہے کہ دیدہ است ازچشم پاکِ حور و ملک قابل تو نیست

سودا نے اس شعر میں تو غضب ہی ڈھا دیا ہے اور لکھتے ہیں
اُس شعر کے معنی میری عقل و فہم سے بالاتر ہیں۔ اگر مکین ہی کی شرح لکھیں

تو شاید ہم ایسے کم فہم سمجھ سکیں۔

فصل پنجم در میان اشعار معترض مرزا فاخر مکین و اصلاح سودا۔

مکین

داغم کہ دل از لالہ بیاد تو زخود رفت
ہمرنگ ببوئے تو اگر ہست دگر نیست

سودا۔ اس محل و موقع پر ہست و نیست کوئی دخل نہیں ہے۔ اگر شاعر واقف فن کچھ بھی ہوتے تو یوں موزوں کرتے۔

از دیدن گل رفت بیادِ تو زخود دل
ہمرنگ بروئے تو اگر ہست دگر نیست

مکین

بسکہ بے نام ونشاں وبیکسم ترسم مکین ہمچناں اُفتاد بگزارند روزِ محشرم

سودا۔ موقع اور محل حقیقتاً تو خوشی اور مسرت کا ہے کہ حشر کے دن کوئی بھی باز پُرس کرنے والا نہیں ہے نہ کہ محل ترس اور خوف کا اس لئے کہ حشر ہی کے برپا ہونے کے وقت خوفِ باز پُرس ہو سکتا ہے۔ فغانی کا شعر ہے۔

بروز حشر فغانی نہ باز پُرس مترس
تو بیکسی و غریبی ترا کہ می پُرسد

میری رائے میں شعر یوں پڑھیے۔

بسکہ بے نام ونشاں ہیکسیم شادم مکیں ہمچناں افتادہ بگزارند روزِ محشرم

مکین

اگر گیرد فلک دستش عجب دارم کہ برخیزد بہ ہر بستر مریضِ نرگسِ بیمار یار افتد

سودا۔ مردمِ بیمار سے دستگیریِ فلک کو کوئی تعلق نہیں ہے۔
مسیحا کی دستگیری میں لطف ہی زیادہ ہے اس لئے کہ نبض سے
بھی اس کا تعلق ہے۔ مصرع اوّل کو یوں پڑھیے۔

مسیح از دست او گیرد عجب دارم کہ برخیزد

مکین

برلب گرہ از بیم تو دل صد گلہ دارد ایں خستہ ندانم چہ قدر حوصلہ دارد

سودا۔ اگر خوف ورجا سے لب پر گلہ یا شکوہ آجائے تو دل کے
حوصلے کی وسعت ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے خوفِ جان ہونا چاہیے جہاں
کہ حوصلہ کار آمد ہوتا ہے۔ کیونکہ جو شخص قوت اور قدرت کی وجہ سے
تمام اشیا پر قادر ہو اور کسی کمزور شخص کے سست اور سخت الفاظ
سُنے تو جواب ممکن ہے۔ اس لئے اگر بیم کی جگہ خو کا لفظ استعمال کیا جائے
تو شعر صحیح ہو جاتا ہے۔

برلب گرہ از خوئے تو دل صد گلہ دارد

مکینؔ

بمہرِ آخر شفیعِ خویش کردی قاتلِ خود را مکینؔ مریخ را ناہید کردن از تو می آید

سوداؔ۔ قاتل اور مقتول میں شفاعت کرنے والا ہمیشہ دوسرا شخص ہوا کرتا ہے۔ شاعر نے خود قاتل کو شفیع گردانا ہے جو آئینِ سخنوری سے بہت دور ہے۔ اس کے علاوہ اُستاد باکمال مکینؔ نے مریخ کو جو کہ تُرکِ فلک ہے اُسے رقاصہ بنایا ہے۔ بفرضِ محال اگر مریخ ناہیدِ فلک ہو بھی جائے تو رقاصی کی صفت مریخ میں پیدا ہو جائے گی نہ کہ شفاعت کی صفت۔ اِس مضمون کو یوں ادا کرنا چاہیئے تھا۔

بمہرِ خویشتن سرگرم کردی قاتلِ خود را مکینؔ مریخ را خورشید کردن از تو می آید

مکینؔ

شب بخوابم چو رُخِ آں دلبرِ عیار نمود بختِ خوابیدہ بر رشک آمد و بیدار نمود

مصرعِ ثانی میں رشک کا لفظ بالکل غلط استعمال ہوا ہے۔ بختِ خوابیدہ اس کا عاشق نہیں ہے کہ اُس کے وصل پر رشک کرے بلکہ بخت کی خوابیدگی یہی ہے کہ عاشق کے مدعا اور مطلب کے خلاف کام کرے۔ اُس کے حصولِ مقصد پر رشک کے کوئی معنی پیدا نہیں ہوتے۔ میرے خیال میں یہ مصرع یوں زیادہ اچھا ہوگا۔

شب بخوابم چو رُخ آں دلبرِ عیّار نمود بختِ خوابیدہ سراپا زدہ بیدار نمود
کیونکہ بیدار کرنے کی رعایت سے سراپا زدن مناسب ہے کسی اُستاد کا شعر ہے۔

درہمہ شہر یکے فتنۂ خوابیدہ نماند کہ سرِ پا زدہ مژگاں تو بیدار نہ کرد

مکینؔ

ایں زماں دام از محبت میزند آں بیوفا
ظلم چرخِ دون و جورِ طالعِ واژون گرفت

سوؔدا۔ دونوں مصرعے قابل تبدیلی ہیں اور دوسرے مصرعوں کے محتاج ہیں۔

ایں زماں دام از محبت میزند آں بیوفا
گشت چوں ریش از خطِ اونم زحد بیروں گزشت

اور مطابق مصرعِ دوم کے مصرع اوّل یوں ہونا چاہئے۔

شکر ایزد را کہ یار از دوستی دم میزند
ظلم چرخِ دوں و جورِ طالعِ واژوں گزشت

مکینؔ

درخدمتِ شاہِ عالم و عالمیان بنشست اگر مکینؔ مزن طعنہ بر آں
برخاک فتد ز خاکساری سایہ ناچار بہ پیشِ آفتابِ تاباں

سودا ۔ آفتاب کی موجودگی میں سایہ کا ہونا یا سایہ پڑنا مکینؔ کی تازہ اور خاص اختراع ہے۔ اُنھوں نے یہ خیال نہیں کیا اور وہ یہ نہ سمجھے کہ نور، روشنی، ظلمت، سیاہی، ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ حافظ علیہ الرحمہ لکھتے ہیں۔

آفتاب از روئے او شد در حجاب　　سایہ را باشد حجاب از آفتاب

اِسی طرح عرفی نے کہا ہے۔

روئے با روئے رود سایۂ او با خورشید　　چشم او چشم کند پایۂ او جنب زحل

سخن رس سمجھ سکتے ہیں کہ کسی محال شے کو عالم مبالغہ میں مدح اور منقبت میں لانا کس قدر مشکل کام ہے۔ اگر سایہ آفتاب کی موجودگی میں جگہ پا سکتا ہے تو ممدوح کے لئے عرفیؔ کا یہ شعر کوئی لطف اور خوبی نہ پیدا کرتا۔

ظاہرا خیال ہوتا ہے کہ مرزا فاخر مکینؔ کے دماغ میں ذیل کا شعر پہلے سے موجود تھا۔ اور اِسی دھوکے میں وہ یہ رباعی لکھ گئے۔

سراسر آفتاب عشق ناپید است عالم را　　تو فکرِ سایہ کن اوّل پس آنگہ سائباں پیدا

میرے خیال میں اس رباعی کے تیسرے مصرع میں حسب ذیل اصلاح کی حاجت اور ضرورت ہے۔

ایں خاک نشیں نشست ہمچوں پرتو　　ناچار بہ پیشِ آفتاب تاباں

بخیال طوالت "مُشتے نمونہ از خروارے" درج کیا گیا ہے۔